آخری مغل

مغل بادشاہت کے زوال کی کہانی

ولیم ڈیلرمپل

فہرست عنوانات

بوڑھے کی موت

نومبر 1862 کو دریائے رنگون کے کنارے انہیں دفنا دیا گیا۔ آخری رسومات میں دو بیٹے اور ایک معمر ملا نے شرکت کی۔ چھوٹے سے مجمع، جنہیں اس موت کا علم ہوا تھا، نے جمع ہونے کی کوشش کی تھی۔ فوجیوں نے انہیں روک دیا۔ ان میں سے ایک دو لوگ فوجیوں سے آنکھ بچا کر میت کو کاندھا دینے آ گئے تھے۔ انہوں نے ملکر لحد کو قبر میں اتار دیا۔

آخری رسومات مختصر رہیں۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد یہ لوگ چلے گئے۔ قبر پر مٹی ڈال دی گئی۔ احتیاط کی گئی تھی کہ کوئی نشان باقی نہ رہ پائے۔ ایک ہفتے بعد برطانوی کمشنر کیپٹن ڈیویس نے لندن بھیجنے کے لئے رپورٹ لکھی۔

''سرکاری قیدی کی موت پر کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس کے پسماندگان بھی افسردہ نہیں۔ رنگون کی مسلمان آبادی نے بھی اس کو کوئی خاص نوٹ نہیں کیا۔ اس جگہ پر گھاس اگ آئے گی اور کوئی نام ونشان نہیں رہ جائے گا''۔

وسطی ایشیا میں وادیٔ فرغانہ سے آنے والے نوجوان ترک شاعر ظہیر الدین بابر نے درہ خیبر 1526 کو پار کیا تھا۔ اور ہندستان میں مغل خاندان کی حکمرانی کی بنیاد ڈالی تھی۔ مغل تیموروں کا گھرانہ جنوبی ایشیا پر تین صدیوں تک حکومت کرتا رہا اور ہندوستان کی تاریخ کی شاندار ترین سلطنت رہی۔

مغلوں نے اسلام کے بہت رواداری انہ اور کثرت القومی روپ کو ڈیفائن کیا۔ ان کی شاندار سلطنت انڈیا کی ہندو اکثریت کے ساتھ ملکر قائم کی گئی تھی۔ خاص طور پر راجستھان کے راجپوتوں کے ساتھ جو مغلوں کی فوج کا بڑا اہم حصہ تھے۔ مغلوں نے کامیابی میدانِ جنگ میں ہی نہیں،

طریقہ حکومت سے حاصل کی تھی۔اور یہ حکمرانی ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت آبادی کو بھی قابل قبول رہی۔یہ مغلوں کی صلحِ کل کی ڈاکٹرائن تھی۔

جس وقت یورپ میں مذہبی جنگیں جاری تھی،مذہبی منافرت پر قتل وغارت کی جارہی تھی،پورا برِ اعظم فرقہ وارانہ آگ کی لپیٹ میں تھا،علم و شعور کو مخالفت کا سامنا تھا،برونو کو گھسیٹ کر تختہ دار پر لے جایا جارہا تھا۔۔۔مغل بادشاہ کی طرف سے فرمان جاری ہوا تھا،''کسی شخص کو کسی دوسرے کے مذہب میں مداخلت کا حق نہیں۔ہر ایک کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہے''۔انتظامیہ کے ہر لیول پر مذہبی تفریق کے بغیر ترقی دی جاتی تھی۔اکبر نے اپنے سابق دشمن،جے پور کے راجہ من سنگھ،پر بھروسہ کرتے ہوئے علاقے کا دفاع انہیں سونپ دیا تھا۔شاہی محل سے دانشوروں اور آرٹسٹ کو خصوصی مقام ملتا تھا۔مسلمان بھی اور غیر مسلمان بھی۔

شاہ جہاں کے دور میں اس سلطنت میں تمام پاکستان کا علاقہ اور افغانستان کا بڑا علاقہ شامل تھا۔فوج ناقابل شکست نظر آتی تھی۔محلات کی شان و شوکت کا دنیا بھر میں مقابلہ نہ تھا۔کئی مزارات کے گنبد سونے سے چمکتے تھے۔

اس ہم آہنگی کے ماحول میں ایک بڑا گھاؤ پالیسی میں تبدیلی تھی اور اس کا ایک بڑا واقعہ گورو تیغ بہادر کو دی جانے والی سزائے موت تھی جو سکھوں کے نو عظیم استادوں میں سے ایک تھے۔اٹھارہویں صدی کے آغاز پر اس عظیم سلطنت میں دراڑ پڑنے لگی تھی۔

جب بہادر شاہ کی پیدائش 1775 میں ہوئی تو مغل عروج کے دن گزر چکے تھے۔برطانوی ابھی ساحلوں پر تین جگہ موجود ایک چھوٹی سی قوت تھے۔اپنی زندگی میں انہوں نے اپنے خاندان کی اہمیت ختم ہوتے دیکھی جبکہ دوسری طرف برطانوی کمزور تاجروں سے جارحانہ ملٹری فورس میں تبدیل ہوتے گئے۔

بہادر شاہ نے اپنا تخلص ظفر رکھا تھا جس کا مطلب فتح ہے۔جب اپنے والد کی وفات کے بعد وہ بادشاہ بنے تو ان کی عمر پینسٹھ سال کے قریب تھی۔اس وقت تک مغلوں کا سیاسی انحطاط روکنا ناممکن ہو چکا تھا لیکن وہ دہلی دربار میں بڑے شاندار دماغ اکٹھا کرنے میں کامیاب رہے۔تمام مغلیہ بادشاہوں میں شاید وہ سب سے زیادہ ٹیلنٹ رکھنے والے،روادار اور ہر ایک میں پسند کئے جانے والے بادشاہ تھے۔ماہر خطاط،مصنف،صوفی،مصوری کا زبردست ذوق رکھنے والے اور مصوروں کی حوصلہ افزائی کرنے والے،باغبان اور امیچور آرکیٹکٹ۔اور وہ ایک سنجیدہ صوفی شاعر تھے۔انہوں نے شاعری نہ صرف اردو اور فارسی میں کی بلکہ براج بھاشا اور پنجابی میں بھی۔اور ان کی سرپرستی تھی جس وجہ سے یہ دور اردو ادب کا ایک سنہرا دور رہا۔وہ نہ صرف خود غزل لکھتے تھے بلکہ مرزا غالب اور ان کے رقیب ذوق جیسے اساتذہ کے ٹیلنٹ کی قدر بھی شاہی دربار سے کی گئی۔یہ ویسے ٹیلنٹ تھے جیسے یورپ میں موزارٹ اور سلیئیری۔

برطانوی اپنا اثر پھیلاتے رہے۔مغل اختیارات کم ہوتے گئے۔سکوں سے مغل نام مٹا دیا گیا۔دہلی شہر کا نظم و نسق بھی مغلوں کے پاس نہ رہا۔اور پھر برٹش نے مغل حکمران پر واضح کر دیا کہ وہ لال قلعے سے مغلوں کو بے دخل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

لال قلعے کا ریکارڈ ہمیں شاہی درباری ریکارڈ میں بھی نظر آتا ہے اور برٹش ریزیڈنٹ کی کورٹ ڈائری میں بھی جو اب نیشنل آرکائیو آف انڈیا کا حصہ ہے۔بہادر شاہ ظفر ہمیں ایک بے ضرر،وضعدار اور رکھ رکھاؤ والے بزرگ کی صورت میں نظر آتے ہیں جو اپنے ادب آداب اس وقت بھی نہیں چھوڑتے جب برطانوی ان کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتے ہیں۔شکار کرنے،مشاعرے کروانے،چاندنی رات سے لطف اندوز ہونے،موسیقی سننے اور آم کھانے کے شوقین۔

مئی 1857 کی صبح کو تین سو سپاہی اور سوار میرٹھ سے دہلی آتے ہیں جو ہر کرسچن مرد، عورت اور بچے کو قتل کر دیتے ہیں جو بھی ان کے ہتھے چڑھتا ہے۔ اور پھر بہادر شاہ ظفر کو اپنا لیڈر اور بادشاہ تسلیم کرتے ہیں اور انہیں انقلاب کی سربراہی کی درخواست کرتے ہیں۔ ظفر برٹش کے دوست نہیں لیکن انقلابی راہنما بھی نہیں۔ لیکن ان کے پاس جو انتخاب تھے، ان کو دیکھ کر انہوں نے انقلاب کے سربراہ کا کردار نبھانے کو ترجیح دی۔ اگرچہ انہیں بہت امید نہیں تھی کہ یہ رنگ لائے گی۔ برٹش دنیا کی طاقتور ملٹری پاور تھے لیکن انہوں نے اپنی بنگال آرمی کے انڈین فوجی گنوا دئے تھے جو برطانوی افسران سے بغاوت کر کے مغل بادشاہ کے جھنڈے تلے اکٹھا ہونے آئے تھے۔

اس فوج کے پاس محدود اسلحہ تھا، پیسے نہیں تھے، سپلائی نہیں تھی، انتظامی ناتجربہ کاری تھی۔ دہلی سے باہر دیہات میں پھرنے والے لٹیروں نے شہر کا ناطقہ برٹش سے بھی زیادہ کامیابی سے بند کر دیا تھا۔ دہلی کے شہری اور انقلابی سپاہی فاقوں کی نوبت پر آ گئے تھے۔

یہ کالونیل دور میں برطانویوں کو پیش آنے والا سب سے بڑا چیلنج تھا۔ یہ 1857 میں ہندوستان پر مغلوں اور انگریزوں کے لئے بقا کی جنگ تھی۔

شہروں کا شہر

دہلی کا 1857 کا محاصرہ برٹش راج کے لئے ہندوستان میں آخری سٹینڈ تھا۔ اگر اس میں ہندوستانی انقلابی کامیاب ہو جاتے تو ہندوستان برٹش کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ کالونیل دور کا سب سے بڑا انعام ان کے پاس نہ رہتا۔ یہ دو طاقتوں کے درمیان ہونے والی موت تک لڑائی تھی، جس میں کوئی بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ اس میں دونوں اطراف نے بے پناہ جانی نقصان اٹھایا۔ دونوں طرف لڑنے والے اپنی ذہنی اور جسمانی ہمت کی آخری حدوں پر تھے۔ برطانوی کئی بار بہت کمزور پوزیشن میں رہے تھے۔ لیکن جنگ کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے 14 ستمبر 1857 کو چار ماہ کے محاصرے کے بعد برٹش فوج نے دہلی پر حملہ کیا۔

برطانویوں نے 1757 میں پلاسی کی جنگ جیتی اور 1893 میں ہنزہ اور نگر کو پروٹیکٹریٹ بنایا۔ ان 136 برسوں میں 1857 ان کے لئے بڑا چیلنج تھا۔ برٹش نے ہندوستان میں جو فتوحات کیں، اس میں سب سے مشکل تختِ لاہور کو الٹانے میں ہوئی اور سکھا شاہی کو الٹنا صرف اس لئے ممکن ہوا کہ پنجاب کے طاقتور حکمران رنجیت سنگھ کے بعد ان کے جانشین کمزور تھے۔ برٹش کی خوش قسمتی رہی تھی کہ 1857 سے صرف چند سال قبل ہی وہ پنجاب فتح کر چکے تھے اور اس میں ایک اہم کردار گلاب سنگھ نے ادا کیا تھا۔ گلاب سنگھ کو انگریزوں نے موجودہ افغانستان کے جلال آباد والا حصہ دینے کی پیش کش کی تھی۔ لیکن جموں سے تعلق رکھنے والے گلاب سنگھ نے جموں اور کشمیر کو خریدنے کو ترجیح دی تھی اور اس کی قیمت اس خزانے سے ادا کی تھی جو رنجیت سنگھ کے خاندان سے حاصل کر کے گاڑیاں بھر کر جموں لے جایا گیا تھا۔

لاہور دربار کی شکست اور جموں کشمیر میں دوست حکمران کے ہونے نے 1857 میں برٹش فتح میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ جب ہندوستان میں فوجیوں نے بغاوت کی تو برٹش اکیلے رہ گئے تھے۔ اور اس وقت میں انہیں سپورٹ ہندوستان کے مغربی علاقے سے ملی تھی۔ پنجابی سکھ اور مسلمان، پٹھان اور کشمیری اور ایک بلوچ رجمنٹ کی آنے والی کمک اس جنگ کا ٹرننگ پوائنٹ تھے۔ جس فوج نے آخر میں دہلی پر کامیابی سے دھاوا بولا تھا، وہ انہی پر مشتمل تھی۔ 1857 میں ہندوستان پر اپنی بقا کی سب سے اہم جنگ لڑنے والی برٹش فوج میں برٹش اس کا بیس فیصد تھے۔

دہلی شہر تاراج کر دیا گیا۔ اس کو لوٹ لیا گیا۔ قتلِ عام ہوا۔ کوچہ چیلاں، جو دہلی کے دانشوروں اور فنکاروں کا محلہ تھا۔ صرف اسی میں کئے گئے قتلِ عام میں 1400 لوگوں کو مار دیا گیا۔ ایڈورڈ وبارٹ جو اس وقت انیس سالہ برٹش آفیسر تھے لکھتے ہیں، ”ہمیں آرڈر تھے کہ کسی ذی روح کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ یہ قتل تھا۔ میں نے زندگی میں بڑا خون اور ہولناک مناظر دیکھے ہیں لیکن جو کل دیکھا، میری خواہش ہے کہ ایسا پھر کبھی

دیکھنے کو نہ ملے۔ عورتوں کو ہم چھوڑ دیتے تھے۔ لیکن جب ان کے سامنے ان کے شوہروں اور بیٹوں کو ذبح کیا جا رہا ہوتا تھا تو ان کی چیخیں سننا تکلیف دہ تھا۔ میں رحمدل نہیں لیکن جب آپ کے سامنے ایک ادھیڑ عمر شخص لایا جاتا ہے اور وہ گر گر کر زندگی کی بھیک مانگ رہا ہوتا ہے تو اس پر گولی چلا دینا بڑا مشکل کام ہے"۔

جو قتل کئے جانے سے رہ گئے، وہ بھاگ کر دیہاتوں کی طرف چلے گئے۔ دہلی کھنڈر رہ گیا۔ مغل شاہی خاندان نے ہتھیار ڈال دئے۔ بہادر شاہ ظفر کے سولہ بیٹوں میں سے زیادہ تر پکڑے گئے۔ مقدمات چلائے گئے اور پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ تین بیٹوں کو بے دردی سے مارا گیا جب وہ ہتھیار ڈال چکے تھے اور قیدی بنا کر لایا جا رہا تھا۔ شہر پہنچ کر سب کے سامنے انہیں کپڑے اتارنے کا حکم دیا گیا۔ اور پھر ایک ایک کر کے تینوں کے سینے میں دو دو گولیاں اتار دی گئیں۔ یہ کرنے والے کیپٹن ولیم ہوڈسن نے اگلے دن خط میں لکھا، "میں ظالم انسان نہیں۔ لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے ان کمینوں کو دوسرے جہان پہنچا کر مزا آیا تھا"۔

بہادر شاہ ظفر کو نمائش کے لئے رکھا گیا جیسے "پنجرے میں جانور" (یہ ایک برٹش افسر کے الفاظ ہیں)۔ ٹائمز کے صحافی ولیم رسل کو بتایا گیا تھا کہ "یہ قیدی مغربی کالونیل دور ختم کرنے کا سب سے خطرناک ماسٹر مائینڈ تھا"۔ رسل لکھتے ہیں کہ "کیا یہ شخص واقعی ایک عظیم سلطنت کی بحالی کا منصوبہ ساز تھا؟ کیا دنیا کی تاریخ کی سب سے بڑی انقلابی فورس انہوں نے بنائی تھی؟ ان کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ آنکھیں زمین پر گڑی تھیں اور حرکت نہ تھی۔ جیسے کچھ معلوم نہ ہو کہ ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ بوڑھی اور تھکی ہوئی آنکھیں۔ کچھ لوگوں نے انہیں جلی ہوئی لکڑی سے دیوار پر شعر لکھتے دیکھا تھا"۔

اس سے اگلے مہینے عدالت لگائی گئی اور ظفر پر مقدمہ چلایا گیا۔ انہی کے پرانے محل کے کھنڈر پر انہیں جلاوطنی کی سزا سنا دی گئی۔ موت کی اس لئے نہیں کہ گرفتاری کے وقت جان بخشی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ان پر ایک الزام یہ لگایا گیا تھا کہ وہ فارس اور ترکی کے بادشاہوں کے ساتھ ملکر عظیم سازش میں مصروف تھے اور یہ انقلاب اس سازش کا پہلا باب تھا۔ اس کا مقصد برطانوی ملکہ کو ہٹا کر دنیا بھر میں مسلم راج قائم کرنا تھا۔ اس الزام کے ثابت ہو جانے کے بعد صبح کے چار بجے انہیں بیل گاڑی میں بٹھا کر دہلی سے بے دخل کر دیا گیا۔

ظفر کے جانے کے بعد ہندوستان سے بادشاہت اور دربار کا خاتمہ ہو گیا۔ ساتھ ہی ان روایات اور آداب کا بھی جو اس دربار سے خاص تھے۔ غالب کے الفاظ میں، "یہ سب بس اس وقت تک تھا جب تک شاہ کی حکومت تھی۔" جب 87 سال کے عمر میں 1862 کو بہادر شاہ ظفر کا انتقال ہوا تو دہلی بہت بدل چکا تھا۔ لال قلعہ کا بڑا حصہ گرایا جا چکا تھا۔ دہلی کا بہت سا حصہ مسمار کیا جا چکا تھا۔ یہاں بسنے والے شاعر اور صوفی، خطاط اور درباری، ملا اور بنیے، تاجر اور شہزادے، سکالر اور ساہوکار لٹکائے جا چکے تھے یا کالا پانی کی ناقابلِ رہائش قید میں بھیجے جا چکے تھے۔ جو بچے، وہ بدترین غربت کی زندگی گزار رہے تھے۔ غالب چند بچ جانے والوں میں سے تھے۔ شاہی خاندان کے جو مر دمارے جانے سے بچ گئے تھے، ان کا بعد میں پانچ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا تھا۔ خواتین کے ساتھ زیادہ برا ہوا تھا۔ غالب کے مطابق،

"دہلی اب ایک صحرا ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔ دہلی کو چار چیزیں زندہ رکھتی تھیں۔ لال قلعہ، جامعہ مسجد پر ہجوم، جمنا کے پل پر سیر اور سالانہ پھولوں کا میلہ۔ کچھ بھی نہیں بچا تو دہلی نے کیسے بچنا تھا۔ ہاں، ہندوستان میں کبھی اس نام کا شہر ہوا کرتا تھا"۔ مورخ جیمز فرگوسن لکھتے ہیں کہ جو دہلی میں ہوا، وہ تباہی تھی۔ اس کے علاوہ ایسا صرف پیکنگ میں ہوا۔ اس کی کوئی وجہ نہ تھی، کوئی جواز نہ تھا۔ ایک وقت میں قسطنطنیہ اور کینٹن کے درمیان اس کے پائے کا کوئی شہر نہ تھا۔ حمام اور باغ، ہزار ستونوں کے ہال اور شاندار مقبرے، صوفی خانقاہیں اور مساجد۔

دہلی شہروں کا شہر تھا۔

انقلاب

جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے لوگ سب سے پہلے دہلی پہنچے اور بسے تو وہ اس جگہ سے اثر قبول کئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے یہاں کی روایات اپنا لیں۔ جب برٹش کمانڈر انچیف کی اہلیہ لیڈی ماریہ نیوجنٹ نے دہلی کا دورہ کیا تو اس کو نوٹ کیا۔ انہوں نے لکھا ہے، ''ہمارے لوگ توان جیسے ہو چکے ہیں۔ ویسے ہی بڑی بڑی مونچھیں رکھنے لگے ہیں۔ گائے اور سور کا گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے۔ ویسے ہی خیالات اپنا لئے ہیں۔ سوائے شکل و صورت کے، یہ لوگ مقامی ہو گئے ہیں''۔

دہلی کا کلچر اپنا لینے والے تاریخ میں ''گورے مغل'' کہلائے گئے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان میں شادیاں کر لیں۔ (''بی بی'' کا لفظ انگریز کی مقامی بیوی کے لئے استعمال ہوتا تھا)۔ کئی لوگوں نے اپنا مذہب بھی چھوڑ دیا۔

انیسویں صدی میں یہ رجحان بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ برٹش برتری تھی جنہوں نے فرانسیسی فوجوں کو بھی فیصلہ کن شکست دے دی تھی اور مقامی حکمرانوں کو بھی۔ دوسری وجہ کرسچن انتہا پسندوں کی آمد تھی جو مقامی آبادی کو تبدیل کرنا چاہتے تھے۔

برطانوی آفیشلز نے 1850 کی دہائی کے اوائل سے پلان بنانا شروع کر دیا تھا کہ مغل بادشاہت کو ختم کر دیا جائے اور نہ صرف برطانوی قوانین اور ٹیکنالوجی انڈیا میں متعارف کروائی جائے بلکہ مسیحیت بھی۔ مغلوں کی رواداری کی جگہ جب ان نئے برٹش خیالات نے لی تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا۔ اور یہ وہ غیر حساسیت تھی جو 1857 کے انقلاب تک لے آئی۔ ہندوستانیوں کے لئے ''جنگِ آزادی'' اور برٹش کے لئے ''غدر''۔ یہ اتنا کامیاب تھا کہ 139000 بنگال فوجیوں میں سے صرف 7796 ایسے تھے جو برٹش آرمی سے وفادار رہے تھے۔ اودھ میں مقامی آبادی ان فوجیوں کے ساتھ ہی اٹھی تھی۔

اس انقلاب کا گڑھ دہلی تھا۔ انقلابی افواج نے شمالی انڈیا سے یہاں کا رخ کیا تھا۔ کانپور پر ناناصاحب کے حملوں کے فوجیوں نے بھی۔ اور انگریزوں کو یہ معلوم تھا کہ اگر دہلی کو قابو میں نہ لے سکے تو ان کی ہمیشہ کے لئے چھٹی ہو جائے گی۔ اور اسی طرح وہ تمام انقلابی سپاہی جو دہلی پہنچے تھے، وہ بہادر شاہ ظفر کو جائز حکمران تسلیم کرتے تھے اور انہیں بھی معلوم تھا کہ دہلی ہاتھ سے گیا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ تمام برٹش فوجیوں کو اس مقابلے سے نپٹنے کے لئے دہلی بھیج دیا گیا تھا۔ اور اس کے لئے مغربی ہندوستان کے لاہور سے پشاور تک جیسے اہم مقامات کو خالی کر دینے کا خطرہ

بھی مول لیا گیا تھا۔ ہندوستان کے گرم ترین موسم کے چار مہینوں میں مغل دارالحکومت برٹش آرٹلری کی گولہ باری سے سنسناتا رہااور ''دہلی والے ''اس لڑائی کے درمیان رہے جو انہوں نے شروع نہیں کی تھی۔

ملک کے دوسرے حصوں میں کیا ہو رہا تھا؟ دہلی میں جمع ہونے والی افواج اس سے بے خبر رہیں۔ شروع میں محاصرہ کرنے والی برٹش افواج کانپور سے جنرل وہیلر کی فوج کا انتظار کر رہی تھیں۔ جبکہ کانپوریوں نے برٹش فوج کو شکست دے دی تھی۔ جنرل وہیلر نے ہتھیار ڈال دئے تھے اور انقلابیوں نے ان کی فوج کے ایک بھی سپاہی کو زندہ نہیں چھوڑا تھا۔ برٹش کو اس شکست کا ایک ماہ بعد پتا لگا تھا۔ دہلی والے فارس سے آنے والی دو افواج کا انتظار کرتے رہے۔ ایک نے درہ خیبر سے پہنچنا تھا اور دوسری نے براستہ سمندر ممبئی سے۔ اس افواہ پر یقین کیا جاتا رہا۔

یہ کسانوں کا انقلاب تھا یا شہری انقلاب۔ طبقاتی کشمکش تھی یا مذہبی جنگ۔ جنگ آزادی تھی یا فوجی بغاوت؟ یہ سب کچھ تھا۔

دہلی خوبصورت خواتین، میٹھے آموں، بہترین شعراء اور نفیس اردو کا شہر سمجھا جاتا تھا۔ جب یہاں انقلابی سب سے پہلے آئے تھے تو انہیں خوش آمدید کہا گیا تھا۔ لیکن یہ جلد ہی بدل گیا تھا۔ دہلی والے بہار سے اور اتر دیش سے آئے لوگوں سے اور ان کی ہلڑ بازی سے خوش نہیں تھے۔ خاص طور پر جب لوٹ مار کے واقعات ہونے لگے تھے۔ دہلی میں ان کو ''تلنگا'' یا ''پوربئے'' (مغرب سے آنے والے) کہا جاتا تھا۔

دہلی اردو اخبار میں ان کی آمد پر پہلے مولوی باقر نے بہت پر جوش مضمون لکھا کہ ''جب ان فوجوں نے آکر ہمیں کفار سے نجات دلائی تو میں سبز پگڑیوں والے سوار ان کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ یہ اللہ کی بھیجی گئی مدد تھی۔ انہوں نے ان کافروں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا''۔

اور دو ہفتے بعد

''جب یہ شہر میں گھنٹا والا سے مٹھائی کھا رہے ہیں اور جامع مسجد کے پاس گپیں لگا رہے ہیں تو یہ اپنی طاقت اور ارادہ کھو چکے ہیں۔ انہیں انگریزوں سے زیادہ دہلی کی عورتوں میں دلچسپی ہے۔ انہوں نے شہر میں اودھم مچا دیا ہے۔ یہ دہلی کے لئے برا وقت ہے''۔

دہلی میں لڑنے والے بہت طرح کے تھے اور یہ ایک نکتے پر متفق تھے۔ مغلیہ سلطنت کی بحالی پر۔ یہ لڑائی شروع ہندو فوجیوں نے کی تھی۔ ہندستان میں تاریخ لکھنے والے اور فلمیں بنانے والے اس نکتے کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے رہے ہیں کہ خواہ میرٹھ کے تھے یا بنگال کے یا کہیں اور کے۔ ہندو فوجیوں نے اکٹھا ہونے کے لئے انہوں نے سیدھا مغل جھنڈے تلے جمع ہونے کے لئے دہلی کا ہی رخ کیا تھا۔

بہادر شاہ ظفر خواہ جتنے بھی بے اختیار تھے، ''خلیفہ الوقت ''اور ''ظل الٰہی '' کہلاتے تھے۔ مسلمان ہوں یا ہندو، سب کے لئے اکٹھا ہونے کی علامت تھے۔

قانونی طور پر بغاوت کرنے والی ایسٹ انڈیا کمپنی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی دو صدیوں سے زیادہ عرصے سے مغل بادشاہ کی زیرِ نگیں تھی۔ کمپنی کو سرکاری طور پر مغلوں نے بنگال سے ٹیکس اکٹھا کرنے کا ٹھیکہ دیا ہوا تھا اور بادشاہ کی اجازت سے اسے کاروبار کرنے کی اجازت تھی۔ تاریخ کا یہ مذاق ہے کہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی نے ایک بادشاہ کو ''غداری '' کے جرم میں سزا سنائی تھی۔

اور یہ وجہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر اپنی کمزوری کے باوجود لوگوں کی امیدوں کا مرکز تھے اور یہ برٹش کے لئے حیران کن تھا کیونکہ وہ اس بادشاہ کو سنجیدہ لینا کب کا چھوڑ چکے تھے۔

اس انقلاب کا ایک پہلو مذہبی جنگ کا تھا۔ جب سپاہی بہادر شاہ کے پاس آئے تھے تو انہیں کہا تھا کی ''ہم اپنا دھرم اور دین بچانے آئے ہیں''۔ جو برٹش مرد و خواتین مسلمان ہو چکے تھے (اور ان کی تعداد کم نہیں تھی)، انہیں کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ جبکہ جو انڈین کرسچن ہو چکے تھے، انہیں بھی مار دیا گیا تھا۔ برٹش آرمی کے لئے ''گورے'' یا ''فرنگی'' کا نہیں، بلکہ ''کافر'' یا ''نصرانی'' کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔

اگرچہ بڑی تعداد میں ہندو تھے، لیکن جہاد کا علم جامعہ مسجد سے بلند کیا تھا۔ اور سب کو مجاہدین، غازی یا جہادی کہا جاتا تھا۔

آج یہ علاقہ اور پرانے کھنڈر غائب ہو رہے ہیں۔ کبھی خبر آ جاتی ہے کہ ذوق کے مقبرے کی جگہ پبلک ٹوائلٹ بن گیا ہے یا غالب کی حویلی کی جگہ کوئلے کا سٹور آ گیا ہے لیکن یہ تاریخی عمارات مٹتی جا رہی ہیں۔ پرانے دہلی کی جگہ اب آئی ٹی کی بلڈنگز، شاپنگ مال اور تیزی سے پھیلتا انفراسٹرکچر لے رہا ہے۔

ان سب کے نیچے دہلی کے پرانے علاقوں میں وہ قتلِ عام ہوا تھا جس نے برٹش کے لئے اس کالونی پر اگلے نوے سال کے لئے ان کا مستقبل محفوظ کر دیا تھا۔

اور اگر کوئی آج کی دنیا میں پاکستان اور انڈیا کے تلخ تعلقات کے ستر سالوں کو سمجھنا چاہے، تو 1857 میں ہونے والا انقلاب اور اس کی عجیب مذہبی تقسیم کو سمجھنا بھی بہت مددگار رہے گا۔ جس میں ایک طرف مسلمان اور ہندو ایک مسلمان بادشاہ کے جھنڈے تلے جمع تھے اور دوسری طرف کرسچن فورسز، جن کے لئے سب سے زیادہ قربانیاں دینے والے سکھ اور مسلمان فوجی تھے۔

ہندوستان پر برطانوی فتح کی تاریخ زیادہ تر برٹش نے لکھی ہے۔ یا پھر کچھ انڈین قوم پرستوں نے۔ اس جنگ کی کئی اطراف تھیں۔ اور یہ ریکارڈ محفوظ رہے ہیں۔ صرف یہ کہ ان کو پڑھنے والے نہیں رہے۔ انہیں زیادہ پڑھا نہیں گیا۔ بھیجے گئے خطوط، عرضداشتیں، درخواستیں، احکام، روزنامچے، اخبارات۔ انڈین نیشنل آرکائیو سے، لاہور میں سیکرٹیریٹ میں پنجاب آرکیائیو اور برما کے آرکائیو میں محفوظ رہے ہیں۔ بہت سا مواد برٹش ریکارڈ کا حصہ ہے۔ یہ اس اہم واقعے کو، دہلی کے عام شہریوں کی آنکھ سے بھی دکھاتے ہیں، انقلابیوں کی نظر سے بھی، انگریزوں کے نکتہ نظر سے بھی اور بہادر شاہ ظفر کی نگاہ سے بھی۔ ان شکستہ تحریروں کو اکٹھا کر کے پڑھنے پر ایک مکمل تصویر بنتی ہے۔ لاہور سے اعجاز الدین، یونس جعفری، عذرا قدوائی، ارجمند آراء، رنگون سے وکی بومین، ہندوستان سے سیما علوی، مرزا فرید بیگ، سندیپ ڈوگل، شیریں ملر اور وینا کپور۔ سکاٹ لینڈ سے ولیم ڈالرمپل اور برطانیہ سے امین جعفر، کرسٹوفر ہبرٹ، مہر اڈالٹن، امریکہ سے نیل فرگوسن، اندرانی چیٹرجی نے ان کی مدد سے تاریخ کا یہ باب ترتیب دیا ہے۔

دہلی اردو اخبار اور سراج الاخبار نے اس سب واقعے کے دوران اشاعت ایک دن کے لئے بھی نہیں روکی اور یہ سب انڈین نیشنل آرکائیو کا حصہ ہیں۔ ظہیر دہلوی، جو اس وقت مغلیہ دربار کا حصہ تھی، کی لکھی گئی ''داستانِ غدار'' بہت کھلے واقعات پر مشتمل ہے۔ مضامین کا یہ سلسلہ ان سب سورسز سے لیا گیا ہے۔ آنے والی اقساط میں قوسین کے درمیان اصل الفاظ ہوں گے جن میں سے کچھ آج کے وقت کے لحاظ سے نامناسب لگیں لیکن یہ ہمیں اس وقت کی فکر کا پتا دیتے ہیں۔

شطرنج کا بادشاہ

فرانسیسی مہم جو فرانسوئے بیمیئر نے شاہ جہاں کی بیٹی روشن آرا بیگم کے 1640 کی دہائی میں کئے گئے کشمیر کے سفر کی داستان لکھی ہے۔ ان کا تبصرہ تھا کہ انہوں نے ایسی شان و شوکت والا سفر نہیں دیکھا۔ انیسویں صدی میں مغل خاندان کی عملداری سمٹ چکی تھی۔ کشمیر گنوائے عرصہ گزر چکا تھا۔ اور سو سال سے زیادہ ہو چکے تھے کہ مغل دلی سے باہر اس طریقے سے نکلیں۔ شاہ عالم ثانی کے دور میں کہا جاتا تھا کہ ''حکومتِ شاہ عالم، از دلی تا پالم'' (پالم دلی سے دس میل دور شہر ہے)۔

خراسان سے تعلق رکھنے والے ترک نادر شاہ تھے جنہیں آخری عظیم ایشیائی فاتح کہا جاتا ہے۔ ان کی بنائی گئی سلطنت اپنے وقت میں دنیا کی طاقتور ترین سلطنت تھی۔ صفوی، ہوتک خاندانوں کا خاتمہ کیا۔ ایران، قفقاز، بحرین، عمان، ترکمانستان، آرمینا، عراق، افغانستان، پاکستان کے علاقے حاصل کئے۔ ایران میں بادشاہت قائم کی۔ ان کی سلطنت جلد ہی فوجی اخراجات کے بوجھ تلے گر کر ختم ہو گئی لیکن ان کی کامیاب فتوحات کے قہر تلے مغل بھی آئے۔ غزنی، کابل، پشاور، سندھ، لاہور پر قبضہ کر لینے کے بعد دہلی آئے۔ لال قلعے کے اندر کے قیمتی خزانے فارس سے آنے والے نادر شاہ نے 1739 میں لوٹے جس میں کوہِ نور ہیرا اور تخت طاوس بھی تھا۔ انہوں نے دہلی کو تاراج کیا۔ تیس ہزار لوگ قتل کئے اور اس قدر لوٹ مار کی کہ واپس جا کر ایران میں تین سال کے لئے ٹیکس معاف کر دیا تھا۔

دہلی شہر کے ایک اور فاتح غلام قادر روہیلہ تھے جنہوں نے 1788 میں اسے فتح کیا تھا اور خود اپنے ہاتھوں سے مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکالی تھیں اور بہادر شاہ ظفر کے والد اور ہونے والے بادشاہ اکبر شاہ دوئم کو سب کے سامنے ناچ نچوایا تھا، شاہی محل کی خواتین کے ساتھ ناقابلِ بیان سلوک کیا تھا اور پھر زخموں پر نمک چھڑکنے کے لئے شاہ عالم کی شاندار لائبریری سے تمام کتابیں نکال کر لے جا کر اودھ کے نواب کو بیچ دیں تھیں۔ غلام قادر کو مرہٹہ فوج نے شکست دے کر قتل کیا اور شاہ عالم کو واپس بحال کیا۔ اس کے بعد مرہٹہ فوج مستقل طور پر دہلی تعینات ہو گئی اور یہ اگلی دو دہائیوں تک رہی جب تک انگریزوں نے مرہٹوں کو شکست سے دوچار کر کے ختم نہیں کر دیا۔ ''تباہ حال محل میں نابینا بادشاہ صرف شطرنج کا بادشاہ تھا''۔ یہ آزاد کا تبصرہ تھا۔

شاہ عالم ثانی کی موت کے بعد مغل عملداری مزید محدود ہو گئی تھی اور یہ پالم تک بھی نہیں رہی تھی۔ یہ لال قلعے کی دیواروں سے زیادہ آگے نہیں تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے اختیارات پر برٹش ریزیڈنٹ تھامس میٹکاف کا چیک تھا۔ اور تھامس اسے وقتاً فوقتاً استعمال کرتے رہتے تھے۔ شاہ کی ذاتی زندگی میں بھی۔

دلی کے باہر سے کوئی بھی معزز اہم شخص میٹکاف کی اجازت کے بغیر دلی میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ خود اپنی زمینوں سے کرایہ وصول کرنے کے لئے بہادر شاہ ظفر کو برٹش سے اجازت لینا ہوتی تھی۔ وہ خود اپنے خاندان کے افراد کو جواہرات تحفہ میں نہیں دے سکتے تھے اور اگر کسی کو بغیر پوچھے تحفہ دیتے جس کا برٹش ریزیڈنٹ کو پتا لگ جاتا تو وہ واپس کروا دیا جاتا۔ ان کے بیٹے مرزا جواں بخت کی شادی پر کشمیر کے راجا گلاب سنگھ نے دربار میں آ کر نذر پیش کی تھی۔ بادشاہ نے جواب میں راجا کو خلعت عطا کی تھی۔ میٹکاف تک خبر پہنچی تو وہ خلعت واپس کروا دی گئی تھی۔ میٹکاف کی نظر میں گلاب سنگھ برطانوی رعایا تھے اور وہ بیرونی حکومت سے براہِ راست تحفہ لینے کے مجاز نہیں تھے۔

برٹش سب سے پہلے دہلی میں 1803 میں آئے تھے، اس وقت انہوں نے مرہٹوں کو دوسری مرہٹہ انگلش جنگ میں شکست دی تھی۔ برٹش نے شاہ عالم کو حفاظت کی پیش کش کی تھی کہ وہ مرہٹوں کے جانے کے بعد انگریزوں کو اپنا محافظ سمجھیں۔ ''ہر ریاست آپ ہی کو سربراہ سمجھتی ہے۔ ہر سکے پر آپ کا نام ہے''۔ اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی بھی شامل تھی۔ کمپنی کی مہر پر بھی اور جاری کردہ سکوں کے نیچے ''فدوی شاہ عالم'' لکھا تھا۔ کمپنی کو برٹش حکومت کی طرف سے سخت ہدایات تھیں کہ ہندوستان کے بادشاہ کی تعظیم کی جائے۔
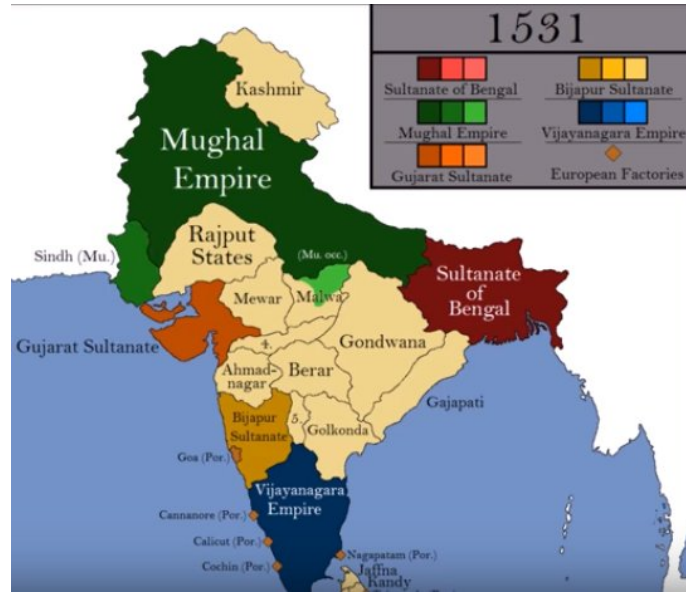
شکل1:1531میں برِصغیر کا سیاسی نقشہ

شکل2:1600میں برِصغیر کا سیاسی نقشہ

شکل3:1700 میں برِصغیر کا سیاسی نقشہ
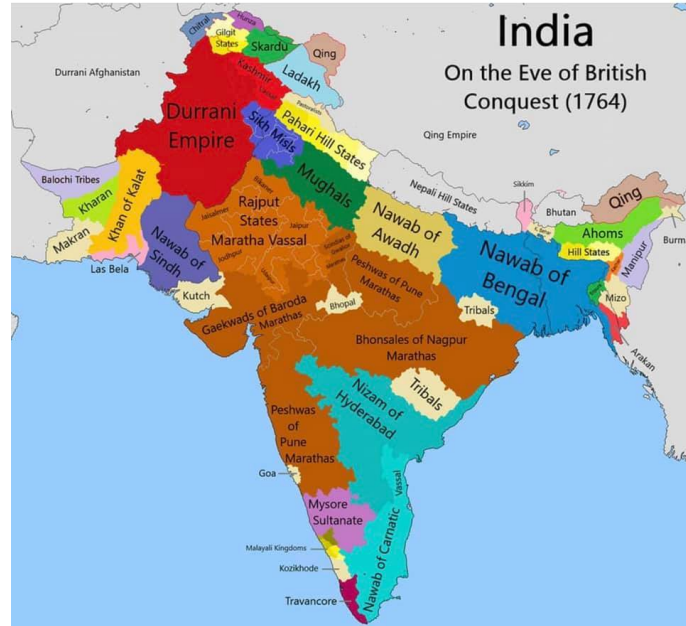
شکل4:1764 میں برِصغیر کا سیاسی نقشہ (اس وقت برٹش نے علاقہ حاصل کرنا شروع کیا)
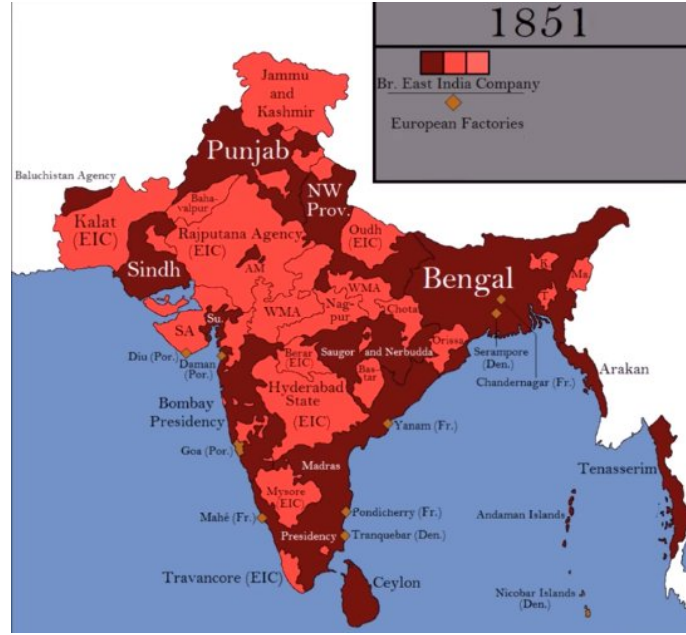
شکل 1857:5 میں برِصغیر کا سیاسی نقشہ (گہرے رنگ میں وہ علاقے جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی براہِ راست حکومت تھی، ہلکے رنگ میں وہ علاقے جہاں مقامی حکمران کے ذریعے بالواسطہ)۔

یہ 1832 میں سر چارلس کی آمد کے بعد بدل گیا تھا۔ بادشاہ کو نذر دینے کی روایت ختم کر دی گئی۔ اس سے اگلے سال مہر اور سکوں پر سے مغل بادشاہ کا نام ہٹا دیا گیا تھا۔ یہ یکطرفہ فیصلہ تھا۔ 1850 میں کمپنی کے لارڈ ڈلہوزی نے کسی بھی برطانوی شہری کو مغل بادشاہ سے کوئی خطاب وصول کرنے پر پابندی لگا دی۔ مغل اختیارات ایک ایک کر کے لئے جاتے رہے۔ 1852 تک، سوائے نام کے، مغلوں کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔

آخری ولی عہد

بہادر شاہ ظفر کے مسائل میں سے ایک ان کے حرم کی خواتین اور ان کا آپس کا تناؤ تھا۔ جب وہ بادشاہ بنے تو ملکہ عالیہ تاج محل بیگم بنیں۔ لیکن یہ پوزیشن بہت دیر برقرار نہیں رہی۔ چونسٹھ برس کی عمر میں انہوں نے انیس سالہ زینت محل سے شادی کی تھی اور چند ہی ماہ میں نئی بیگم نے تاج محل کی جگہ لے لی۔ بادشاہ نے اس کے بعد چند مزید خواتین حرم میں داخل کیں لیکن زینت محل ان کی پسندیدہ بیوی رہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے 16 بیٹے اور 31 بیٹیاں تھیں۔ آخری بیٹے مرزا شاہ عباس کی پیدائش جب ہوئی تو بہادر شاہ ظفر ستر برس کے تھے۔

بادشاہ کے بیٹوں کی زندگی اچھی تھی اور وہ اپنے شوق پورے کر سکتے تھے لیکن لال قلعے کے کوارٹروں میں دو ہزار سے زیادہ جونئیر سلاطین بھی رہائش پذیر تھے۔ یہ پچھلے بادشاہوں کے پوتے اور پڑپوتے تھے یا ان کی بھی آگے نسل سے تھے۔ ان کی زندگی اکثر غربت میں گزرتی تھی۔ کبھی محل سے چوری چکاری کے الزام میں چوبداران سلاطین کی پٹائی بھی کر دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ، سو سے زیادہ سلاطین نے ملکہ برٹش ریزیڈنٹ کو خط لکھا تھا کہ ان کے حقوق کے لئے کچھ کیا جائے۔

بہادر شاہ ظفر کی کوشش تھی کہ وہ اپنے بعد اپنی مرضی کا جانشین کا تقرر کر سکیں۔ ان کے بڑے بیٹے دارا بخش کی وفات بخار آ جانے کے بعد 1849 میں ہو گئی۔ اگلا نمبر مرزا فخرو کا تھا۔ لیکن زینت محل کی خواہش اپنے بیٹے مرزا جوان بخت کو بنوانے کی تھی۔ یہ بیٹوں میں پندرھویں نمبر پر تھے اور عمر آٹھ سال تھی۔

انگریزوں نے ہندوستان میں حکمرانی کے وراثتی جھگڑوں سے نمٹنے کے لئے قانون بنایا تھا کہ کسی بھی فرمانروا کی موت کی صورت میں بڑا بیٹا حکمران ہو گا اور اس سے کوئی استثنا نہیں۔ نواب، راجہ، خان، مہاراجہ اور شاہ سب پر یہ لاگو تھا۔ 1832 میں اس میں یہ اضافہ کر دیا کہ اگر کسی مقامی حکمران کا کوئی بیٹا نہیں ہو گا تو اس علاقے کا انتظام کمپنی براہِ راست لے لے گی۔ اس کو lapseofdoctrine کہا جاتا تھا۔

بہادر شاہ ظفر نے لیفٹیننٹ گورنر کو خط لکھ کر درخواست کی تھی کہ مرزا جوان بخت نہ صرف ان کے ہاتھوں سے تربیت پا رہا ہے بلکہ ان کی جائز بیوی کی اولاد بھی ہے، اس لئے ولی عہد جوان بخت کو بنانے کی اجازت دی جائے۔ یہ درخواست دلچسپ اس لئے تھی کہ بہادر شاہ ظفر کا بادشاہ بننا بھی اسی قانون کے مرہونِ منت تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے والد اپنے بڑے بیٹے سے ناخوش تھے اور انہوں نے بھی انگریز سرکار کو خط لکھا تھا کہ ولی عہد کو تبدیل کرنے کی اجازت دی جائے جو مسترد کر دی گئی تھی۔

ولی عہد مرزا فخرو نے انگریزی سیکھنی شروع کر دی تھی۔ اور انگریز افسروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے انگریز لیفٹیننٹ جنرل سے بات طے کر لی تھی کہ وہ انہیں بادشاہ بننے دیں تو وہ دو سو سال سے مغل بادشاہت کا مرکز لال قلعہ انگریزوں کے حوالے کر کے مہروالی منتقل ہو جائیں گے۔ انگریز اسے اسلحہ ڈپو، فوجی بیرک اور انتظامی مرکز کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ دوسری بات فخرو نے یہ طے کر لی تھی کہ وہ مغلوں کے پرانے دعوے سے دستبردار ہو جائیں گے کہ مغل برٹش گورنر جنرل سے بالاتر ہیں اور برابری کو رسمی طور پر تسلیم کر لیں گے۔

بہادر شاہ ظفر کو جب اس معاہدے کا علم ہوا تو فخرو پر بہت غصہ کیا۔ ان کا مشاہرہ بند کر دیا۔ سرکاری پوزیشنوں سے معزول کر دیا۔ ان کی جائیداد چھوٹے شہزادوں کے حوالے کر دی۔ لوگوں کو ان کا بائیکاٹ کرنے کو کہا۔ لیکن جب آہستہ آہستہ واضح ہو گیا کہ کچھ نہیں ہو سکتا تو ظفر مایوسی کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے میٹکاف کو لکھا کہ ”میری ہر خواہش رد کر دی جاتی ہے اور یہ میرے لئے ناخوشی کا باعث ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں بادشاہت چھوڑ کر حج کرنے مکہ چلا جاؤں اور باقی ایام وہیں گزاروں۔ اس دنیا تو میں ہار چکا ہوں لیکن کہیں اگلی دنیا میں بھی نہ ہار جاؤں“۔ بعد میں انہوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔

تھامس میٹکاف چالیس سال سے دہلی میں تھے۔اپنے پیشروؤں کے برعکس مغل پگڑی اور لباس نہیں پہنتے تھے اور نہ ہی پچھلے برٹش ریزیڈنٹ ڈیوڈ اوکٹرلونی کی طرح تھے جنہوں نے ہندوستان میں تیرہ شادیاں کی تھیں اور ہاتھیوں کے قافلے پر سیر کرنے نکلتے تھے جس میں ہر بیوی کا اپنا اپنا ہاتھی تھا۔میٹکاف کی بیوی فوت ہو چکی تھیں۔وہ اکیلے رہا کرتے تھے۔نہ کوئی شوق رکھا ہوا تھا۔کام میں جتے رہا کرتے تھے۔دہلی کے آرٹ سے دلچسپی تھی۔دہلی آرکیولوجیکل سوسائٹی بھی انہوں نے شروع کی تھی جس کے ایک پرجوش ممبر سید احمد خان تھے۔اس سوسائٹی کے رسالے کا انگریزی ترجمہ خود کیا کرتے تھے۔

جہاں پر دوسرے برٹش افسران ہندوستان میں تعیناتی کو عارضی سمجھتے تھے،میٹکاف نے یہاں مستقل رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ان کے لئے یہی گھر تھا۔دہلی میں اپنے لئے گھر تعمیر کروائے تھے۔بہادر شاہ ظفر سے دوستانہ روابط تھے۔ان کا انتقال 1853 میں ہوا۔

شکل6: تصویر مرزا فخرو کی پینٹنگ ہے، جو مغل خاندان کی آخری ولی عہد تھے۔1856 میں ان کی وفات کے بعد کوئی ولی عہد نہیں بنا۔

تھامس میٹکاف کے بیٹے تھیومیٹکاف جو کہ مجسٹریٹ بنے اور انہیں "کانا میٹکاف" کہا جاتا تھا۔1857 میں ان کا سفاکانہ کردار ایک وجہ رہی کہ برٹش پارلیمنٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے 1858 میں اختیارات چھین لئے اور ہندوستان کو براہِ راست تاجِ برطانیہ کے ماتحت کر دیا۔

مذہبی اختلافات

ریورنڈ مجلے جیننگز ہندوستان میں 1832 میں پہنچے تھے۔ وہ کرسچن کمیونیٹی کے مذہبی راہنما تھے اور ان کا ایک اپنا ہی خیال تھا۔ ''برٹش سرکار نے ہندوستان سے کوہِ نور ہیرا لے لیا ہے۔ اس کا قرض چکانا ہے اور وہ یہاں کے قدیم مذاہب کی جگہ مسیحیت کی روشنی پھیلنے سے ہو گا''۔ یہ جیننگز کی ڈائری سے ہے۔ دہلی کے چرچ میں ان کی تعیناتی 1852 میں ہوئی۔ جیننگز ایک مذہبی جنونی تھے جو خود اپنے ہم مذہب لوگوں کی اکثریت میں بھی زیادہ پسند نہیں کئے جاتے تھے۔ لیکن 1850 کی دہائی میں انڈیا میں کرسچن مذہبی حلقوں میں ایسے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔

پشاور کے کمشنر ہربرٹ ایڈورڈز کے مطابق، ''یہ سلطنت ہمیں خدا نے تحفے میں دی ہے تا کہ ہم پروٹسٹنٹ ازم یہاں پھیلا سکیں''۔

فتح پور میں ڈسٹرکٹ جج نے دس کمانڈمنٹ کا ترجمہ فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی میں کر کے مختلف مقامات پر لگوا دیا تھا اور ہندوستانی زبان میں مقامی لوگوں کو اکٹھا کر کے بائبل سنایا کرتے تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے چند افسر بھی اس نئے کام کے حق میں تھے۔ کرنل چارلس گرانٹ کا کہنا تھا، ''خدا نے ہمیں یہ زمین اس لئے نہیں عطا کی کہ ہم یہاں سے صرف منافع کمائیں۔ مال، دولت، پیسہ دنیاوی چیزیں ہیں۔ ہمیں اپنی اقدار بھی مقامی لوگوں تک پہنچانی ہیں''۔ اس نئے عود آنے والے مذہبی جذبے کے ایک سپورٹر کلکتہ کے بشپ ریجینالڈ ہیبر تھے۔ ہیبر کی اردو میں لکھی گئی حمدیں آج بھی چرچ میں پڑھی جاتی ہیں۔

انگریزوں کی آمد سے لے کر انیسویں صدی کے آغاز تک مسلمان علماء کا انگریزوں سے رویہ دوستانہ رہا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مسلمان علماء مرہٹہ حکومت کے مقابلے میں برٹش راج کو ترجیح دیتے تھے اور انگریزوں کی آمد کے وقت مرہٹے ہندوستان کی سب سے بڑی پاور تھے۔ مسلمانوں نے کمپنی کی ملازمت اختیار کی جس میں قانون دان، منشی، ور کریا استاد کے پیشے بھی تھے۔

جب انگریز پہلی بار دہلی آئے تو یہ مقامی لوگوں کے لئے ایک انوکھی چیز تھے۔ایک بات مشہور ہوئی کہ یہ سیلون کی خواتین اور بندروں کے ملاپ سے ہیں۔شاہ ولی اللہ کے بیٹے شاہ عبدالعزیز نے باقاعدہ فتوٰی جاری کیا کہ "یہ ہماری طرح کے ہی لوگ ہیں۔یہ وہ ہیں جنہیں قرآن میں نصاریٰ کہا گیا ہے۔ان سے میل ملاپ رکھا جاسکتا ہے۔ان کی ملازمت کی جاسکتی ہے۔ان کے ساتھ ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھایا جاسکتا ہے، چہ جائیکہ کوئی حرام شے نہ ہو"۔

کئی مسلمان مولوی تھے جنہوں نے برٹش خواتین سے شادیاں کیں۔دہلی کے کئی حلقوں میں میسحیت میں انٹلکچوئل دلچسپی بھی رہی۔1807 میں جب مغل دربار میں نیو ٹیسٹیمنٹ کا عربی ترجمہ پیش کیا گیا تو نہ صرف اسے شکریے سے قبول کیا گیا بلکہ مزید کی فرمائش بھی ہوئی۔

کئی مسلمان علماء کے ذاتی تعلقات اور دوستیاں رہیں۔شاہ عبدالعزیز کی دہلی کے کمشنر ولیم فریزر کے ساتھ بہت دوستی تھی۔فریزر ان سے ہفتے میں دو بار فارسی اور عربی پڑھنے آتے تھے۔فریزر ہندوستانی روایات سے متاثر تھے۔شاہ عبدالعزیز انہیں شریعت کے باریک نکتے سمجھایا کرتے تھے۔

ولیم فریزر کا ایک اور شوق دہلی کے پڑھے لکھے لوگوں کی محفل میں بیٹھنا تھا جن میں ایک مرزا غالب بھی تھے۔فریزر نے گائے اور سور کا گوشت کھانا ترک کر دیا تھا اور مغل لباس اپنا لیا تھا۔

فریزر ایسا کرنے میں اکیلے نہیں تھے۔ایسے کئی اور برطانوی تھے۔برٹش ریزیڈنٹ سر ڈیوڈ اوکرلونی ہندوستانی پاجامے اور پگڑی میں نظر آتے تھے۔حقے اور دہلی کی رقاصاؤں کے ناچ دیکھنے کے دلدادہ تھے۔ان کی تیرہ بیویاں ہندوستان سے تھیں۔ان کی ایک شادی پونے کی ایک برہمن رقاصہ سے ہوئی تھی جنہوں نے بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا۔یہ بی بی مبارک النساء تھیں۔یہ مشہور تھا کہ جرنیلی بیگم کہلانے والے اس خاتون سے برٹش کمشنر خاص ادب کر رہتے تھے۔

ان گھرانوں میں اسلامی روایات اور حساسیت کو اچھی طرح سمجھا جاتا تھا اور ان کا احترام کیا جاتا تھا۔اوکٹرلونی کے کچھ بچے مسلمان تھے۔مبارک بیگم کے ساتھ ان کی بیٹی کی شادی مرزا غالب کے بھتیجے سے ہوئی تھی۔

ایسے کئی خاندان تھے جو انگلستان سے آئے تھے اور نسل در نسل مقامی کلچر میں رچ بس گئے تھے۔ہانسی کے سکنر، سردھانہ کے سومرو، خاص گنگ کے گارڈنر۔۔۔اسلامو کرسچن بفرزون کہلائے جاسکتے تھے۔فارسی اور ہندوستانی بولنے والے اور ہر لحاظ سے تقریباً اسلامی مغلیہ طرز کی زندگی گزارنے والے۔

بہادر شاہ ظفر کی فرسٹ کزن مختار بیگم کی شادی ولیم گارڈنر کے بیٹے سے ہوئی تھی۔ولیم کے والد نے کامبے کی بیگم سے شادی کی تھی۔اس خاندان کے آدھے لوگ مسلمان تھے اور آدھے کرسچن۔

کرسچن مشنری پہلے بھی اپنے پمفلٹ تقسیم کرنے، تبلیغ کرنے اور مناظرے کرنے کا کام کرتے تھے۔مسلم مسیحی مکالمے ہوا کرتے تھے، لیکن انیسویں صدی کے وسط میں آنے والے کرسچن تبلیغی شدت پسند ہر ایک کے لئے ناخوشگوار اضافہ تھے۔اور انہوں نے مقامی طور پر برطانویوں کے امیج کو بہت نقصان پہنچایا۔

برٹش نے کچھ مقامی مذہبی رسومات کو ممنوع قرار دیا تھا۔جس میں 1829 میں ستی کی رسم کو غیر قانونی قرار دئے جانا تھا۔(بیوہ کو شوہر کے ساتھ ہی جلا دینا)۔اس پابندی کو کچھ ہندو مذہبی حلقوں میں پسند نہیں کیا گیا تھا۔ہندو بیواؤں کو دوبارہ شادی دینے کی اجازت کے قانون نے اونچی ذات کے کئی ہندوؤں کو بہت رنج پہنچایا تھا۔جیل میں قیدیوں کو میسحیت کی تبلیغ کی اجازت ملنا اور مشنریوں کو یتیم بچوں کی پرورش کرنے کے لئے ادارے بنانے دینا مذہبی حلقوں میں بہت قابل اعتراض رہا۔

ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ برٹش نے جہاں زمین حاصل کی، وہاں پر مندروں، مسجدوں، مزارات، مدارس سے ان کی زمین کے ریکارڈ کے ثبوت مانگے جاتے تھے۔ نہ دئے جانے پر ان کی سرکاری امداد بند کر دی جاتی تھی۔ اس نے مذہبی راہنماؤں کو نئے حکمرانوں کے خلاف کیا۔

سڑکوں کی تعمیر کے دوران مساجد اور مندروں کو منہدم کئے جانا۔ اور حماقت خیز غیر حساسیت سے ضبط شدہ مذہبی مقامات کو کئی مقامات پر کرسچن مشنری کے سپرد کر دئے جانا۔۔ اس نے ہندوستانی آبادی کے جذبات مجروح کئے۔

اگرچہ ہندوستان میں ان نئے آنے والوں کو خاص کامیابی نہ ملی لیکن یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ انیسویں صدی کے وسط میں ہی وہ ماحول بنا کہ برٹش سرکار کی طرف سے کی گئی ہر اصلاح اور نئی چیز کو شک کی نظر سے دیکھے جانے لگا، خواہ وہ کتنی ہی عام سی اور کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہو۔ اور یہی وہ وقت تھا جب مشنری فوبیا کی وجہ سے برٹش کی طرف سے بنائے گئے ہسپتال، سکول اور کالج سے بھی کئی مقامی لوگ کترانے لگے۔

فکری تصادم

برٹش نے سکھوں کو جب 1849 میں بالآخر شکست دے کر پنجاب کا بڑا حصہ قابو کر لیا تو ان کے پاس جنوبی ایشیا میں کوئی مقابلہ نہیں بچا تھا۔ تمام عسکری حریفوں کو مات دے دی گئی تھی۔ بنگال میں سراج الدولہ کو 1757 میں، فرانسیسیوں کو 1761 میں، میسور کے ٹیپو سلطان کو 1799 میں۔ مرہٹوں کو 1803 میں اور پھر 1819 میں شکستِ فاش دی گئی۔

ان عسکری فتوحات نے تکبر کو جنم دیا تھا۔ پہلی بار یہ تاثر بننے لگا تھا کہ ٹیکنالوجی، معیشت، سیاست اور کلچر میں برٹش کے پاس ہندوستان سے سیکھنے کو کچھ نہیں، سکھانے کو بہت کچھ ہے۔ یہ گفتگو اب ہونے لگی تھی کہ انگریزوں کا فرض ہے کہ ان نیم تہذیب یافتہ جاہل لوگوں کو مہذب بنائیں۔ یہ وہ وقت تھا جب میکالے نے کہا تھا کہ "یورپ کی اچھی لائبریری کی ایک شیلف انڈیا اور عرب کے پورے لٹریچر پر بھاری ہے۔ سنسکرت میں لکھی گئی بہترین کتابیں برطانیہ میں پرائمری سکول کی کتاب کے مقابلے کی نہیں۔ جس طرح روس کو مہذب بنایا گیا ہے، ویسے ہندوستانی کو بھی بنایا جا سکتا ہے"۔

ہندوستان سینکڑوں زبانوں کا علاقہ تھا۔ ایک جگہ کے لوگ دوسری جگہ کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ اس مسئلے کا حل مغلوں نے فارسی سے نکالا تھا۔ مغرب سے آنے والی یہ زبان ہندوستان کو جوڑنے کی زبان تھی اور ہندوستان میں پڑھائی جاتی تھی۔ یہ عوامی زبان نہیں تھی بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان سمجھی جاتی تھی جو پنجاب سے بنگال تک استعمال ہوتی تھی۔ ادیب، شعراء، دانشور، علماء اس کا استعمال کرتے تھے اور یہ ہندوستان کی سرکاری زبان تھی۔

نئے آنے والے نئی زبان بھی لائے۔ 1837 میں فارسی کو ختم کر کے انگریزی کو سرکاری زبان بنا دیا گیا۔ برٹش انڈیا پر برٹش مزاج، روایات اور اقدار کے مطابق حکومت ہونا تھی۔ پچھلے آنے والوں کی زبان فارسی کا وقت ختم ہوا جو رفتہ رفتہ مٹ گئی۔ اس کی جگہ انگریزی نے لے لی جو ہندوستان کو اکٹھا رکھنے والی اور کاروبارِ حکومت چلانے والی زبان بن گئی۔

یہ وہ وقت تھا جب "گورے مغل" ہمیں کم ہوتے نظر آتے ہیں۔ ہمیں بیبیاں (انگریزوں کی مقامی بیویاں) کم ہوتی نظر آتی ہیں جو 1850 کے بعد تقریباً غائب ہو گئیں۔ اس کی وجہ کلچرل دوری تھی اور برٹش کا کلچرل برتری کا احساس تھا۔ ہندوستانی خاتون سے شادی کرنا اب کسی کو اپنے رفقاء میں مذاق بنوا دیتا تھا۔ ہندوستانی پاجامہ اب انگریزوں کے لئے شب خوابی کا لباس رہ گیا جسکو گھر سے باہر پہننے پر شرمندگی محسوس کی جاتی تھی۔ پگڑی اور بڑی مونچھیں ترک کر دی گئیں۔

جیننگز کی تبلیغ جاری تھی اور 1852 میں انہیں دو اہم کامیابیاں ہوئیں۔ ایک ڈاکٹر چمن لال تھے جو بہادر شاہ ظفر کے ذاتی معالج تھے اور دوسرا ان کے دوست ماسٹر رام چندرا جو ماہر ریاضی دان تھے دہلی کالج میں پڑھاتے تھے۔ جیننگز نے بڑی عوامی تقریب منعقد کی جس میں یہ تبدیلی مذہب سب کے سامنے نمایاں دکھائی گئی۔ اس طریقے سے یہ بپتسمہ مقامی آبادی کے لئے خدشات کا باعث تھا۔ کئی معززین نے اپنے بچوں کو دہلی کالج سے اٹھا لیا۔ پرو برٹش علماء بھی اب خدشات کا شکار ہونے لگے۔ دہلی کے صدر الصدور (مفتی اعظم) مفتی صدرالدین آزردہ، جنہوں نے تیس سال تک مغل اور برٹش تعلقات مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا، اب اس نئے برٹش رویے سے نالاں تھے۔ کمبھ میلے میں شرکت کرنے والے سادھوؤں کو چیخ چیخ کر تبلیغ کرنا اور انہیں بتایا کہ وہ کیوں گمراہ ہیں۔۔۔ جیننگز کے یہ طریقے ہندوستانی مزاج سے میل نہیں کھاتے تھے۔

بہادر شاہ ظفر کا تعلق چشتیہ صوفی سلسلے سے تھا اور صوفی خانقاہوں اور مزارات پر آنا جانا رہتا تھا۔ ظفر خود کو صوفی پیر کہتے تھے اور مریدوں کو قبول کرتے تھے۔ دہلی اردو اخبار نے انہیں ایک جگہ پر "زمانے کا سب سے بڑا صوفی" بھی لکھا۔ دربار میں پیروں کا بھی آنا جانا رہتا تھا اور بادشاہ

کو علاج کے لئے تعویذوں پر اعتقاد تھا۔

لیکن بہادر شاہ ظفر کے کردار کا ایک اور پہلو بھی تھا جو ان کی شاعری میں نظر آتا ہے اور یہ گہری صوفی شاعری اور تصورِ فنا ہے۔ مرزا غالب کو لکھے گئے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں کہ ''علماء کا فقہی موشگافیوں تک محدود رہنا اور حیض و نفاس جیسے مسائل میں الجھے رہنا، اصل روحانیت کو دبا دیتا ہے۔ خدا تک پہنچنے کا راستہ کچھ اور ہے۔ یہ صوفی طریقہ سیکھنے میں ہے''۔

بہادر شاہ ظفر انتہا پسندی سے معاملہ کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور مذہبی حساسیت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ''مغل مسلمان اور ہندو آبادی کے مسلمان بادشاہ ہیں''۔ انکے قلعے میں ہولی بھی منائی جاتی تھی جس میں بادشاہ خود رنگ پھینکتے تھے۔ ہندو تہواروں پر محل کے ہندو افسران کو تحائف دیتے تھے اور دیوالی پر اپنے وزن کے برابر سامان خیرات کرتے تھے۔ ایک بار دہلی کے دو سو مسلمانوں نے ان سے استدعا کی کہ انہیں عیدالاضحیٰ پر گائے کی قربانی کی اجازت دی جائے تو انہیں ڈانٹ دیا گیا، ''اسلام میں قربانی صرف گائے کی ہی کرنا فرض نہیں۔ کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچانا آپ کا فرض اور ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ اور خاص طور پر اس وقت، جب آپ تعداد میں زیادہ ہوں اور پوزیشن میں طاقتور''۔

انیسویں صدی میں وقت کے ساتھ آرتھوڈوکس نظریات میں شدت آتی گئی۔ بہادر شاہ ظفر کا طریقہ تنقید کی زد میں آتا گیا۔ جس طرح برٹش مذہبی شدت پسند طاقت پکڑ رہے تھے، ویسے ہی مسلمان بھی۔ دونوں ایک دوسرے کو مضبوط تر کر رہے تھے اور دونوں کے آپس میں تصادم کے لئے راہ ہموار ہو رہی تھی۔

بادشاہ کے ایک بڑے نقاد سید احمد بریلوی تھے، جنہوں نے موجودہ خیبر پختونخواہ کے علاقے میں سکھوں اور برٹش سے جہاد شروع کیا تھا، جس میں ناکام رہے تھے۔ سکھوں اور افغانوں کی جنگیں ہوتی رہی تھیں اور دونوں کے درمیان علاقے ہاتھ بدلتے رہے تھے۔ سید احمد بریلی نے افغان مدد پر انحصار کیا تھا لیکن افغانوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ سکھوں سے شکست کے بعد ان کی وفات 1831 میں ہوئی۔ ان کے مجاہدین کے نیٹورک پشاور، انبالہ، دہلی اور پٹنہ تک پہنچ گیا تھا۔ ایک دوسری فکر شاہ ولی اللہ سے شروع ہوئی تھی جو صوفی طریقت کے خلاف تھی۔ ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز مفتی تھے (یہ دہلی کے کمشنر ولیم فریزر کے دوست اور ان کے استاد بھی تھے) اور پنجاب کے تاجروں پر انکا زیادہ اثر تھا۔

جیننگز کے طرز کی مذہبی شدت پسندی اور برٹش امپیریل ازم کے ردِ عمل نے ان تحریکوں کو مضبوط کیا۔ آنے والے وقتوں میں ہر طرف کے انتہا پسند ایک دوسرے کے لئے تقویت کا باعث بنتے رہے۔

شکل7: زبانوں کی فیملی کا نقشہ ہے

شکل8: تصویر میں انڈو آریئن فیملی کی چند زبانوں کو مزید تفصیل سے دکھایا گیا ہے۔(ہندی اور اردو کو ایک ہی گروپ میں رکھا گیا ہے)۔

پرانے گودام کے تنکے

''برٹش انڈیا جتنا طاقتور آج ہے، پہلے کبھی نہیں تھا۔ ہر طرف امن وسکون ہے۔ قانون کی بالادستی ہے۔ ملک محفوظ ہے۔ لوگ خوش ہیں۔ پچھلے کچھ برسوں میں برٹش راج اور ہندوستانی عوام نے بہت ترقی کی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اتنا مضبوط اور اتنا سنہرا دور پہلے نہیں آیا۔ اس کے درمیان میں ہندوستان میں علامتی بادشاہت کو مزید برقرار رکھنا ایک مذاق ہو گا۔ دہلی کا شاہی گھرانہ ہر لحاظ سے غیر متعلقہ ہو چکا ہے۔ اس کے جانے پر کوئی مسلمان بھی افسوس نہیں کرے گا''۔ برٹش انڈیا کے گورنر جنرل چارلس کیننگ نے یہ رپورٹ 1856 میں لکھی۔

آخری مغل ولی عہد مرزا فخرو کا انتقال 10 جولائی 1856 کو ہیضے کی وجہ سے ہوا۔ اس سے اگلے روز برٹش ریزیڈنٹ سائمن فریزر بادشاہ سے افسوس کرنے گئے تو بادشاہ نے درخواست کی کہ انہیں اپنی مرضی کا جانشین منتخب کرنے دیا جائے۔ فریزر کے ذہن میں کچھ اور ہی تھا۔

فریزر نے اس سے پہلے گورنر جنرل کو کہا تھا کہ، ''کوئی بھی شہزادہ اس قابل نہیں کہ اسے اگلا بادشاہ بنایا جائے۔ نہ ان میں کوئی خوبی ہے اور نہ صلاحیت۔ سوائے خاندانی دولت پر عیش و عشرت کے سوا کچھ کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ مغلیہ خاندان کے اختتام کی تیاری کر لیں جو بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا اور وہ وقت دور نہیں''۔ گورنر جنرل کیننگ نے فریزر سے اتفاق کیا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے doctorine of lapse کا طریقہ شروع کیا تھا۔ اس کے مطابق، اگر کوئی مقامی حکمران فوت ہو جائے جس کا کوئی مرد وارث نہ ہو یا حکمرانی کے قابل نہ ہو تو کمپنی اس علاقے پر براہِ راست کنٹرول حاصل کر لے گی۔ سمبل پور، ناگپور، جھانسی، جیت پور اور آرکٹ کی ریاستیں اس طریقے سے برٹش کنٹرول میں آئی تھیں۔ یہ سب بہت چھوٹی ریاستیں تھی لیکن گورنر جنرل نے دہلی کے بارے میں بھی فیصلہ لے لیا تھا کہ تاریخی اور بڑا قدم لینے کا وقت آ گیا ہے۔ اب تین صدیوں سے زیادہ جاری مغلیہ بادشاہت کو ختم کر دینے کا وقت ہے۔ مرزا فخرو کی وفات کے بعد نیا ولی عہد بنانے کی اجازت نہیں دی گئی۔

کیننگ کی یہ خوداعتمادی اس وجہ سے تھی کہ برٹش سرکار کا رابطہ ہندوستانی عوام سے کٹ چکا تھا اور رائے عامہ کا اندازہ نہیں رکھتا تھا۔ دہلی میں یہ پیغام دے دینے کا مطلب یہ تھا کہ مغل خاندان کی رہی سہی کوئی امید بھی دم توڑ گئی۔ یہ وہ غلطی تھی جس کا خمیازہ انہیں جلد ہی بھگتنا پڑنا تھا۔

بہادر شاہ ظفر کو مرزا فخرو کی موت اور برٹش کا اودھ کی ریاست کو براہِ راست کنٹرول میں لے لینے کے بعد مغل خاندان کا اختتام نظر آ رہا تھا۔ اکاسی سالہ بادشاہ کی خواہش اب یہی رہ گئی تھی کہ جتنا ان کے پاس ہے، آگے وراثت میں دے جائیں۔ انہوں نے لارڈ ڈلہوزی کو خط لکھا تھا کہ ''میری زندگی تو زیادہ نہیں بچی۔ میری خواہش صرف یہ ہے کہ میرے بعد میرے خاندان کو تکالیف کا سامنا نہ ہو''۔ ڈلہوزی نے سیکرٹری کے ذریعے جواب لکھوایا کہ ''آپ اپنی زندگی میں بیگمات اور شہزادوں کو جو معیارِ زندگی دے رہے ہیں، وہ اس کے بعد جاری نہیں رہ سکتا''۔

ابراہیم ذوق کو بہادر شاہ ظفر نے استاد مقرر کیا تھا۔ ان کی وفات 1854 میں ہوئی۔ ان کے بعد بادشاہ نے یہ عہدہ مرزا غالب کے پاس آیا۔ غالب دہلی میں مغلوں کے مستقبل کے بارے میں زیادہ پرامید نہیں تھے۔

غالب نے ملکہ وکٹوریا کو ایک خط لکھا جس میں ان کی مدح سرائی کے بعد کہا کہ ''آپ ہند کی روایات سے واقف نہیں۔ تاریخ کے عظیم حکمران شاعروں اور نکتہ وروں کا منہ موتیوں سے بھر دیتے تھے، انہیں سونے سے تول دیا کرتے تھے، جاگیریں عطا کرتے تھے۔ اب یہ عظیم حکمران ملکہ وکٹوریا کا فرض ہے کہ غالب کو مہرخوان کا لقب دیں، خلعت عطا کریں۔ اور کچھ نہیں تو اپنے خزانوں میں سے بس ایک تھوڑا سا حصہ دے دیں جس کو انگریزی میں پنشن کہا جاتا ہے''۔

غالب اس خط کے جواب کا انتظار کرتے رہے، اس کا جواب جنوری 1857 میں آ گیا کہ ان کی درخواست پر غور کیا جائے گا۔ نہ مہرخوان کا لقب ملا، نہ جاگیر عطا ہوئی اور نہ پنشن ملی لیکن اس جواب نے اس سب سے زیادہ اہم کام کیا۔ چند ماہ بعد، اس نے غالب کی جان بچا لی۔

غالب کی مایوسی کی ایک وجہ یہ تھی کہ عام دہلی والوں کے برعکس وہ مغربی سائنسی ترقی سے واقف تھے جو انہوں نے کلکتہ میں خود دیکھی تھی۔

سرسید احمد خان مغل شان و شوکت پر لکھ رہے تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے آئینِ اکبری کا اردو میں ترجمہ لکھا اور مرزا غالب کو دیباچہ لکھنے کو کہا۔ غالب نے احمد خان کو نہ صرف منع کر دیا بلکہ ساتھ مشورہ دیا کہ یہ بے کار کی کاوش ہے۔ ماضی کو دیکھنا ختم کریں، آنے والے وقت کی فکر کریں۔

''ان برطانوی صاحبوں کو دیکھیں۔ یہ ہمارے مشرقی آباء سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ ان کے بحری جہازوں نے ہوا اور لہر کی ضرورت ختم کر دی ہے۔ یہ آگ اور بھاپ سے انہیں چلاتے ہیں۔ یہ مضراب کے بغیر موسیقی بجا لیتے ہیں۔ ان کے جادو سے لفظ پرندوں کی طرح ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں (ٹیلی گراف)۔ انہوں نے ہوا میں آگ لگا لی ہے۔ بغیر تیل کے چراغوں کے شہر روشن کر دئے ہیں۔ ان کے قوانین نے ہمارے قوانین کو فرسودہ کر دیا ہے۔ پرانے گودام سے تنکے چننے کا کیا فائدہ جب موتیوں کا خزانہ سامنے پڑا ہو۔

اکبر کے آئین کی تعریف اس وقت کرنے کا کیا فائدہ جب نئی دنیا کا آئین کلکتہ میں لکھا جا رہا ہے''۔
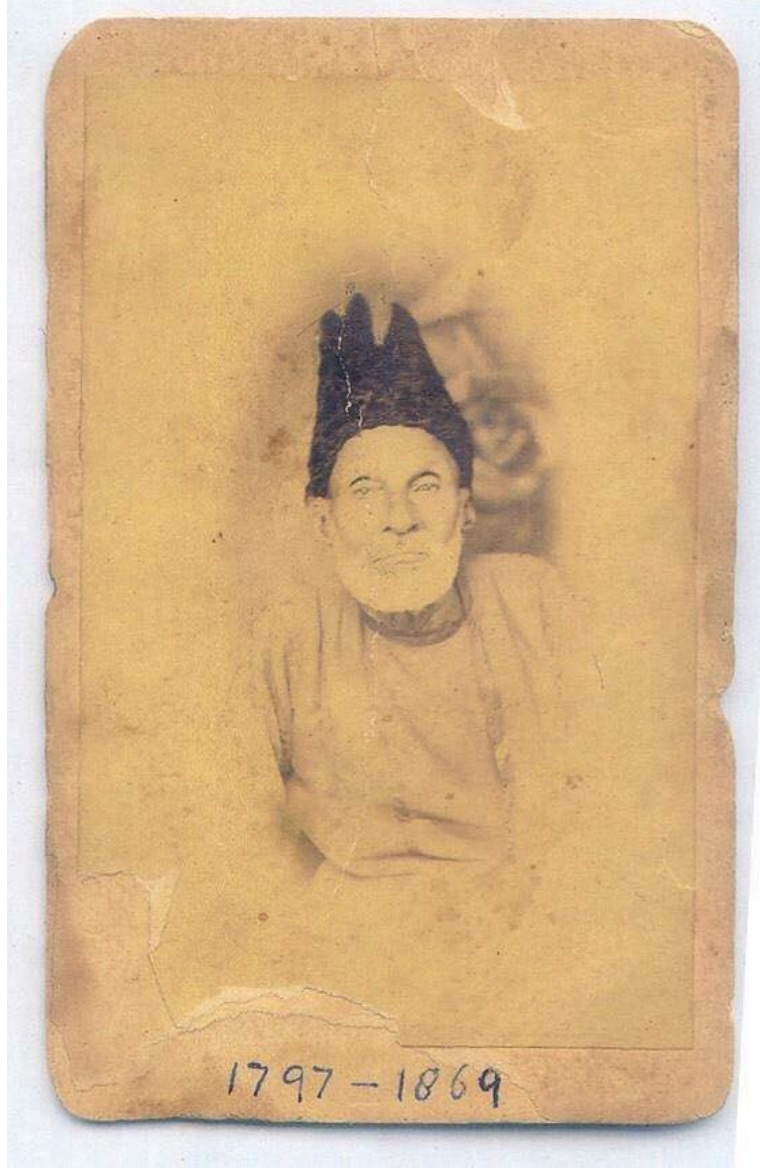
شکل 9: ساتھ لگی تصویر مرزا غالب کی۔ یہ ان کی واحد محفوظ تصویر ہے جو ان کے دوست بابو شیو نارائن کے پاس تھی۔ ان کی پڑپوتی سنتوش مدہور نے اسے پبلک کیا۔

طوفان کی آمد

دہلی کی جامعہ مسجد کے دروازے پر 18 مارچ 1857 کو ایک پوسٹر چسپاں تھا۔ ایک ننگی تلوار اور ڈھال بنی تھی، جس کے ساتھ لکھا تھا کہ یہ شاہِ ایران کی طرف سے آنے والا پیغام ہے۔ فارس میں برطانوی فوج کو عبرت ناک شکست ہوئی ہے اور فارسی فوج افغانستان میں ہے۔ ہرات سے اب سرحد کی طرف بڑھ رہی ہے اور دہلی کو کرسچن حکمرانی سے آزاد کروائے گی۔ پانچ سو ایرانی پہلے ہی بھیس بدل کر دہلی میں موجود ہیں اور نو سو فوجی مزید بڑھ رہے ہیں۔ اور دہلی کے مسلمان کرسچن حکمرانوں کی مدد سے باز رہیں۔

تین گھنٹے تک یہ پوسٹر مسجد کے دروازے پر لگا رہا اور بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں تھیں۔ تھیو میٹکاف نے یہ پوسٹر پھاڑ دیا۔ اگلے روز سراج الاخبار میں اس پوسٹر کی خبر پورے صفحے پر شائع ہوئی۔ ساتھ لکھا تھا کہ کیا یہ اصل ہے؟ شہر میں افواہیں گرم ہو چکی تھیں۔ "روسی فوج ہندوستان پر حملہ کر چکی ہے"، "مدراس میں کفار کے خلاف فتوٰی دیا جا چکا ہے"، اصل اور نقل خبریں بازاروں میں پھیلنے لگیں۔ دہلی افواہوں کی زد میں تھا۔ سب سے اہم اصل خبر بنگال آرمی کی انگریزوں کے خلاف بیرک پور اور برہم پور میں اٹھنے والی بے چینی کی تھی۔

فروری 1856 میں کمپنی نے ایک نیا کام کیا۔ اودھ کی بڑی اور امیر ریاست کے نواب کو نااہل کہہ کر برطرف کر دیا گیا اور ریاست کا نظام سنبھال لیا۔ اودھ کے نواب ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوست رہے تھے۔ اگرچہ نواب کی نااہلی کو جواز بنایا گیا تھا اور "اودھ بلیو بُک" شائع کی گئی تھی کہ نواب کی اخلاقی اور مالیاتی کرپشن کی وجہ سے ریاست کتنے جرائم اور مصائب کا شکار ہے۔ اس میں کسی کو شک نہ تھا کہ اصل وجہ کرپشن نہیں، لکھنو کی دولت پر قبضہ تھا۔ نواب بالکل بھی پسند نہیں کئے جاتے تھے، اور اس نے اس کارروائی کا جواز دے دیا تھا۔ نہ صرف اودھ کے محصولات پر قبضہ کیا گیا بلکہ اس سے حاصل ہونے والے مالِ غنیمت بھی کمایا گیا۔

مرزا غالب نے اس پر لکھا تھا کہ "اگرچہ میں اودھ کے معاملات سے اجنبی ہوں لیکن اس ریاست کے ساتھ جو کیا گیا، میں اس پر اداس ہوں اور شاید ہی کوئی ہندوستانی ہو، جو اسے ناانصافی نہ سمجھتا ہو"۔

اودھ کو برٹش راج کا حصہ بنا لینے کے بعد برٹش فوج کے سپاہیوں کی آمدنی کم ہو گئی۔ General Service Enlistment Act جاری کر دیا گیا جو غیر مقبول تھا اس میں سپاہیوں کے لئے سمندر پار کرنے کو تیار رہنے کی شرط بھی تھی۔ اونچی ذات کے ہندو یہ مذہباً نہیں کر سکتے تھے۔ "یہ ہمارا دھرم چھین لینا چاہتے ہیں" یہ خوف نمایاں ہو رہا تھا۔

نچلی ذات کے ہندوؤں کی بھرتی زیادہ تیزی سے کی جا رہی تھی اور پروموشن جلد مل رہی تھی۔ کمپنی کا کہنا تھا کہ یہ لوگ اونچی ذات والوں کی طرح تنگ نہیں کرتے اور نہ ہی مذہبی معاملات میں زیادہ حساس ہیں۔ یہ زیادہ کارآمد سپاہی ہیں۔

این فیلڈ رائفل فوج میں متعارف کروائی گئی۔ اس کو گریس دینی پڑتی تھی اور یہاں یہ افواہ پھیلی کہ یہ گریس سور اور گائے کی چربی سے بنائی گئی ہے (اور شاید یہ افواہ ابتدائی طور پر درست تھی)۔

یہ وہ پس منظر تھا جب بنگال میں بیرک پور میں 29 مارچ 1857 کو ایک سپاہی منگل پانڈے نے اپنے برٹش افسروں پر گولی چلا کر انہیں زخمی کر دیا۔ منگل پانڈے کو فوری پھانسی دے دی گئی۔ جلد ہی انبالہ میں گڑبڑ شروع ہوئی۔ اپریل کے

آخر پر یہ میرٹھ تک پھیل چکی تھی جہاں پر تھرڈ لائٹ انفینٹری نے گولیاں چلانے سے انکار کر دیا۔ صوبیدار میجر منصور علی نے حکم عدولی کرنے پر پچاسی سپاہیوں کو دس سال قید کی سزا دے دی۔ لیکن ہنگامے میرٹھ بازار تک پھیل گئے تھے۔

دس مئی 1857 دہلی میں ایک گرم اور گردآلود دن تھا۔ ٹیلی گراف سے میرٹھ میں ہونے والے ہنگاموں کی خبر دہلی تک پہنچ گئی تھی۔ چار بجے دہلی اور میرٹھ کا ٹیلی گراف رابطہ ٹوٹ گیا۔ اس سے پہلے دہلی کے کمشنر فریزر تک ایک ٹیلی گرام پہنچا تھا لیکن اس وقت وہ جلدی میں تھے۔ اگلے روز انہیں یہ صفحہ کھولنا یاد آیا۔ ناشتے پر انہوں نے اسے پڑھا۔ یہ ایک وارننگ تھی۔ میرٹھ کے سپاہیوں نے اپنی کمانڈ کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ اتوار کی شام انہوں نے کرسچن آبادی کو قتل کر دینے کا منصوبہ بنایا تھا۔ فریزر خوفزدہ ہو کر اٹھے اور اپنے لئے بگھی منگوائی تاکہ فوری طور پر کچھ کیا جائے لیکن فریزر کے لئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ ان کی زندگی کے دن پورے ہو گئے تھے۔

میرٹھ کے سپاہی نہ صرف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور قتلِ عام کیا تھا بلکہ وہ رات بھر سفر کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ عین اس وقت وہ دہلی کے قریب کشتیوں کا پل پار کر رہے تھے کہ وہ دہلی میں داخل ہو سکیں۔ انہیں اپنے بادشاہ کے پاس پہنچنا تھا۔ میرٹھ کے سپاہیوں کو مغلیہ دور واپس چاہیے تھا۔ بہادر شاہ ظفر کو ابھی اس کا علم نہیں تھا لیکن انقلاب شروع ہو چکا تھا اور وہ اس کے سربراہ تھے۔

شکل 10: منگل پانڈے

ساتھ لگی تصویر منگل پانڈے کا سکیچ ہے۔ منگل پانڈے کی بنگال میں چلائی گئی گولی اس انقلاب کا آغاز تھا۔ یہ چلانے کے پیچھے ان کی سوچ کیا تھی؟ اس پر کنفیوژن ہے۔ اپنے کورٹ مارشل میں انہوں نے کہا کہ اس روز انہوں نے افیم اور بھنگ پی تھی اور حواس میں نہیں تھے۔ یہ غالباً دفاع کے لئے کہا گیا تھا لیکن اس سے قطع نظر، منگل پانڈے بنگال میں ہیرو سمجھے جاتے ہیں۔ جس جگہ پر انہوں نے گولی چلائی اور انہیں پھانسی دی گئی، اس کا نام شہید منگل پانڈے ماہا اودیان

ہے۔ ان کی یادگار تعمیر کی گئی ہے۔ ان کی یاد میں ٹکٹ جاری کیا گیا تھا۔ ان پر کئی فلمیں بن چکی ہیں۔

تلوار کی کاٹ

صبح سات بجے بہادر شاہ ظفر لاٹھی کا سہارا لئے تسبیح خانے سے دریا کا نظارہ کر رہے تھے کہ انہیں جمنا کے پاس دھواں اٹھتا نظر آیا۔ انہوں نے پالکی بردار کو آواز دی کہ وہ فٹافٹ جا کر معلوم کریں کہ ماجرا کیا ہے۔ جلد ہی خبر مل گئی کہ یہ انقلابی تھے جنہوں نے دریا پر محصول چونگی کو آگ لگا دی تھی۔ سب سے پہلے مارے جانے والوں میں چونگی لینے والے اور پھر ٹیلی گراف آفس کے مینجیر چارلس ٹوڈ تھے جو پتا لگانے اس جانب گئے تھے۔ ظفر نے حکم دیا کہ شہر کے دروازے بند کر دئے جائیں اور اگر دیر نہیں ہو گئی تو پل توڑ دیا جائے۔

لیکن پانچ سو سوار شہر کے اندر پہنچ چکے تھے۔

تھیو میٹکاف کی اس روز چھ ماہ کی چھٹی شروع ہو رہی تھی جو انہوں نے کشمیر میں گزارنی تھی۔ اس روز مرنے والوں میں وہ شامل نہیں تھے۔ اور چھپ کر شہر سے بھاگ کر جان بچا لی تھی۔ فریزر، پادری جیننگز اور دو مشہور کنورٹ سمیت اس روز کسی کو نہیں بخشا گیا۔ اس بغاوت میں انگریز مسلمانوں کو نہیں چھیڑا۔ عبداللہ بیگ ایک برٹش تھے جو مسلمان ہوئے تھے، نہ صرف انہیں کچھ کہا نہیں گیا بلکہ وہ اس میں انقلابیوں کا ساتھ دیتے رہے۔ سارجنٹ میجر گورڈن، چونکہ مسلمان ہو چکے تھے، انہیں کچھ نہیں کہا گیا۔

انقلابیوں کی حمایت طبقاتی بنیادوں پر بھی تھی۔ مزدور اور کپڑا ساز اس کے پرجوش حامی رہے۔ دہلی کی اشرافیہ منقسم تھی۔ عبدالطیف کا کہنا تھا کہ ""تمام مذہبی تعلیمات کو نظر انداز کیا گیا۔ عورتوں اور بچوں کو بھی نہیں چھوڑا گیا""۔ غالب نے اپنی ناپسندیدگی لکھی، ""مجھے ان بچوں پر ترس آتا ہے جو خون کے سمندر کے بھنور کا حصہ بن گئے""۔

ظہیر دہلوی لکھتے ہیں، ""کرتے اور دھوتیوں میں ملبوس تین چار افراد کو دیکھا۔ تلواریں اڑسی ہوئی، پیپل کے درخت تلے کھڑے پوریاں اور مٹھائی کھا رہے تھے۔ میں آگے چل دیا۔ یہاں پر ایک بڑا پہلوان نما شخص نظر آیا جس نے بڑی لاٹھی کاندھے پر اٹھا رکھی تھی اوراس کے پیچھے بھی ویسے ہی حلیے والے کئی لوگ تھے۔ یہ سب دیکھنے میں بدمعاش لگ رہے تھے۔ انہوں نے شہر کی مشعلیں ڈنڈے مار کر توڑ دیں۔ ایک نے ہنس کر دوسرے کو بتایا کہ میں نے ابھی ایک کافر مارا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کپڑے کی دکان کا تالا توڑا اور میں وہاں سے بھاگ گیا۔ کوتوالی کے قریب دکانیں لوٹی جا رہی تھیں۔ بینک لوٹ لیا گیا۔ برسفورڈ کے خاندان کو عورتوں اور بچوں سمیت مار دیا۔ دہلی کے لفنگے، چمار، دھوبی، نائی، قصائی، کاغذی گلی سے کاغذ بنانے والے، جیب کترے، پہلوان اور بدمعاش بھی ان کے ساتھ مل گئے تھے۔ شہر کے شرفاء گھروں میں تالے لگا کر بیٹھے تھے۔ کسی کو نہیں پتا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ ایک گھنٹے میں چودہ لاکھ روپیہ لوٹا گیا ہو گا۔ چاندنی چوک کے پاس فساد چل رہا تھا۔ خون دریا کی طرح بہہ رہا تھا۔ محل کے دروازے کے قریب پچاس سوار نظر آئے۔ انگریزی کی کتابیں پھاڑ کر صفحے اڑا رہے تھے""۔

کچھ کو لوٹا گیا کہ وہ برٹش حکومت کے ساتھ تھے۔ کچھ کو اس لئے کہ وہ امیر تھے۔

دہلی اردو اخبار میں محمد باقر نے خبر لگائی کہ ""یہ انگریز پر خدا کا قہر نازل ہوا ہے۔ جب انقلابی سپاہی یہاں آ رہے تھے تو کہتے ہیں کہ ان کے آگے اونٹنیاں تھیں جس میں سبزپوش سوار تھے۔ یہ غیبی مدد تھی۔ انہیں جہاں انگریز ملے، ان کو قتل کیا۔ بے شک اللہ تکبر کو پسند نہیں کرتا۔ ان پر اتنی کاری ضرب اسی گناہ کا نتیجہ ہے""۔

شام تک دہلی شہر میں رہنے والے برٹش کا بڑے پیمانے پر صفایا ہو چکا تھا۔ یا موت کے گھاٹ اتارے جا چکے تھے یا دہلی چھوڑ چکے تھے۔

شاہی محل کے لئے یہ بیرونی حملہ آور تھے۔ اس سے پہلے جب لال قلعے میں اس طریقے سے بغیر اجازت کوئی مسلح گروہ داخل ہوا تھا، وہ غلام قادر رہیلہ تھے جنہوں نے اس طریقے سے دہلی میں گھس کر 1783 میں مغل بادشاہ کو باندھ کر ان کی آنکھیں نکال دی تھیں۔ بہادر شاہ ظفر اس وقت آٹھ برس کے تھے۔ اور اب باہر سے آنے والے سینکڑوں سپاہی بغیر جوتے اتارے شاہی محل میں پھر رہے تھے۔ اپنے گھوڑے بادشاہ کے پسندیدہ باغ میں باندھے ہوئے تھے۔ بادشاہ سے ملاقات کا تقاضا کر رہے تھے۔

چار بجے بادشاہ دیوانِ خاص میں آئے اور سپاہیوں کو شور کم کرنے کو کہا اور کہا کہ وہ اپنے افسروں کو بات کرنے کے لئے آگے کریں۔ کچھ سوار آگے آئے اور بادشاہ کو بتایا کہ وہ اپنے دین کی اور اپنے دھرم کی حفاظت کرنے کے لئے اٹھے ہیں۔ انہیں سور اور گائے کی چربی دی گئی تھی۔ انہوں نے میرٹھ میں یورپیوں کو قتل کر دیا ہے اور اب دہلی میں اپنے بادشاہ کے پاس آئے ہیں"۔

بہادر شاہ ظفر نے جواب دیا، "میں نے کسی کو نہیں بلایا تھا۔ تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا"۔

سپاہیوں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ ان کا ساتھ دیں۔ بحث چلتی رہی۔ بادشاہ کا کہنا تھا کہ "ہمارا سورج تو ڈھل چکا ہے۔ یہ ہمارے آخری دن ہیں۔ مجھے صرف کچھ سکون کی خواہش ہے"۔

حکیم احسن اللہ خان نے سپاہیوں کو کہا کہ "تم لوگوں کو ماہانہ تنخواہ کی عادت ہے۔ بادشاہ کے پاس خزانہ نہیں۔ تم لوگوں کو کیسے تنخواہ ادا کی جا سکے گی"۔ سپاہی افسر نے کہا" ہم دولت کے لئے نہیں آئے۔ آپ حکم دیں گے تو ہم پوری سلطنت سے آپ کا خزانہ بھر دیں گے۔ بہادر شاہ ظفر کا کہنا تھا کہ "نہ میرے پاس سپاہی ہیں، نہ اسلحہ، نہ خزانہ۔ اور نہ ہی میں اس عمر میں ہوں کہ کسی کا ساتھ دے سکوں یا لڑ سکوں"۔ افسروں کا جواب آیا، "ہمیں صرف آپ کی حمایت درکار ہے۔ باقی ہم سنبھال لیں گے"۔

یہاں پر بہادر شاہ ظفر نے ایک وقفہ لیا۔ اس میں سوچا ہو گا کہ ان کے پاس کیا چوائس ہے۔ بہادر شاہ کی خوبیوں میں بروقت قوتِ فیصلہ نہیں رہی تھی۔ لیکن یہ تاریخ کا ایک فیصلہ کن موڑ تھا۔ اس مرتبہ یہاں پر انہوں نے اپنی روایتی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی۔ ان کے درباری ان سپاہیوں کا ساتھ دینے کے حق میں نہیں تھے لیکن شاید اپنی زندگی کے اہم ترین فیصلے میں انہوں نے آنے والوں کو اپنی حمایت دے دی۔ انقلاب کی سربراہی قبول کر لی۔

ظہیر دہلوی کے مطابق، "بادشاہ تخت پر بیٹھ گئے۔ سپاہی، افسر اور سارے ایک ایک کر کے آگے آتے، سر جھکاتے۔ ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور پیچھے ہٹ جاتے"۔ بہادر شاہ ظفر کے اس فیصلے کے ساتھ یہ اب چند سو باغی سپاہیوں کی بغاوت نہیں رہی تھی۔ اب یہ ہندوستان کے آخری بادشاہ کی آخری مزاحمت تھی۔
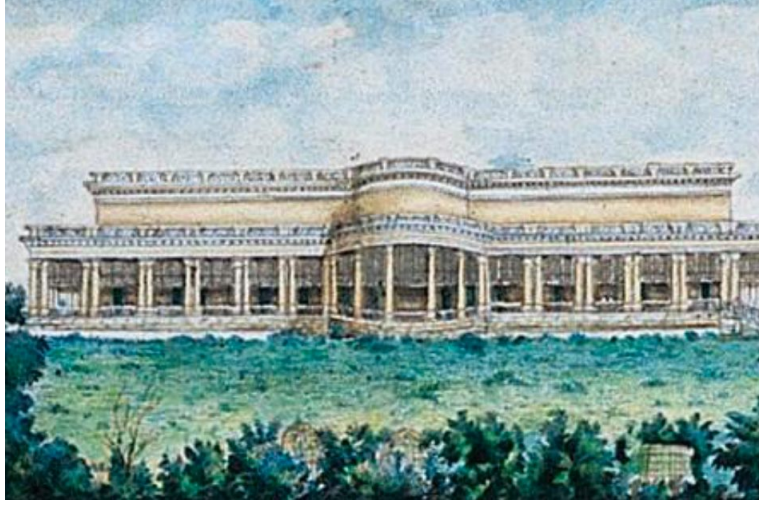
شکل 11: ''جہاں نما'' کا سکیچ جو منصور علی خان نے بنایا۔ یہ جمنا کنارے میٹکاف کا گھر تھا۔ بارہ مئی کو اس کو جلا دیا گیا تھا

شکل 12: ''جہاں نما'' کے جلائے جانے کے بعد کی تصویر

مکڑی کا جال

دہلی سے شمال میں کیپٹن رابرٹ ٹٹلر دہلی میں ہو جانے والے واقعات سے بے خبر اپنے 200 سپاہیوں کو کمانڈ کر رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ فوج میں کچھ گڑبڑ تو چل رہی ہے لیکن کس حد تک؟ اس کا علم نہیں تھا۔ دہلی میں اور دہلی کے باہر برٹش راج تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ ٹٹلر کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے سپاہی میرٹھ والوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ انہوں نے نوٹ کیا کہ اس روز اسلحہ ڈپو میں ہر کوئی معمول سے زیادہ اسلحہ اٹھا رہا ہے۔ انہوں نے اور کیپٹن گارڈنر نے نوٹ کیا کہ سپاہی عمارت سے دور کھڑے ہیں۔ جب انہیں قریب آنے کو کہا تھا سپاہیوں نے جواب دیا کہ انہیں دھوپ اچھی لگ رہی ہے۔ جب انہیں سختی سے آرڈر دیا تو ایک سپاہی نے جواب دیا کہ آپ کی سرکار ختم ہو گئی ہے۔ برٹش راج کا دور گزر گیا ہے۔ پھر سب نے ملکر نعرے لگانے شروع کر دئے، ''پرتھوی راج کی جے ہو''۔ سپاہیوں کی بڑی تعداد انہیں چھوڑ کر اور اسلحہ لے کر چلی گئی۔ ان کے ساتھ چند درجن فوجی رہ گئے جو زیادہ عمر کے تھے اور افغانستان کی جنگ رابرٹ ٹٹلر کے ساتھ اکٹھے لڑی تھی۔

یہ کئی جگہ پر دہرایا جا رہا تھا۔ کئی یونٹس میں سپاہی افسروں کو سلیوٹ کرنے کے بعد الوداع کر کے جا رہے تھے۔

افطار کے وقت دہلی کی گلیاں سنسان ہو گئیں۔ ظہیر دہلوی جو شاہی محل سے واپس آ رہے تھے، کہتے ہیں، '' شہر میں خاموشی تھی اور عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گھروں اور حویلیوں کے دروازے مقفل تھے۔ روشنی کسی جگہ پر نہیں تھی۔ سڑک کے لالٹین ٹوٹے ہوئے اور ان کے شیشے بکھرے پڑے تھے۔ چاقو بنانے والوں، حلوائی اور بزازوں کی دکانیں لوٹ لی گئی تھیں۔ ایک جگہ پر ایک شخص قریب المرگ کراہ رہا تھا۔ اسے تلواروں کے تین گھاؤ لگے ہوئے تھے۔ ایک جگہ مجھے تین لوگ نظر آئے جنہوں نے ایک دھوبی کو روکا ہوا تھا۔ وہ اس کے سامان کی تلاشی لے رہے تھے کہ کوئی قیمتی شے مل جائے۔ دھوبی نے انہیں بتایا کہ فلاں جگہ پر ایک فرنگی کا گھر ہے۔ جلدی پہنچو، مال کوئی اور نہ لے جائے اور یوں دھوبی نے ان سے جان چھڑوائی''۔

بارہ مئی کو دہلی برٹش سے تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ 1803 کو برٹش نے مرہٹوں کو شکست دی تھی، تب سے دہلی برٹش کنٹرول میں تھا۔ ایک روز میں یہ ختم ہو گیا تھا۔

بہادر شاہ ظفر نے نہ یہ انقلاب پلان کیا تھا اور نہ ہی یہ سب ان کے وہم و گمان میں تھا اور نہ ہی یہ سپاہی ان کے کنٹرول میں تھے اور نہ ہی ان کے پرتشدد طریقوں سے اتفاق کرتے تھے۔ لیکن وہ پوری طرح سے ان کے ساتھ شامل ہو چکے تھے۔ موہن لال کاشمیری لکھتے ہیں۔

''باغی اب شہر کے اور محل کے بھی مالک تھے۔ انہوں نے بادشاہ کو زور دیا کہ وہ شہر کا دورہ کریں تا کہ سب کا اعتماد بحال ہو۔ بادشاہ نے پہلی بار یہ دیکھا تھا کہ تربیت یافتہ سپاہی ان کے ساتھ ہیں۔ انہوں نے شہریوں کو دیکھا جو انہیں دیکھنے امڈ آئے تھے۔ اداس اور معمول کے چہروں کے ساتھ نہیں، نعرے لگاتے ہوئے۔ یہ تبدیلی پہلے روز شہر میں اکثریت کو پسند آئی تھی۔ بادشاہ نے برٹش ناکامیوں کی خبریں سنیں۔ انہوں نے جھوٹی خبریں بھی سنیں کہ برٹش فوج فارس میں پھنس چکی ہے۔ اور یہ کہ یورپ میں سیاسی حالات کشیدہ ہو چکے ہیں اور ہندستان میں کوئی کمک نہیں آ سکے گی۔ انہیں بتایا گیا کہ ممبئی اور دکن میں بھی بغاوت پھوٹ پڑی ہے۔ بہادر شاہ ظفر اب یقین کر چکے تھے کہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں عظیم تیموری خاندان کے تاج اور سلطنت کی بحالی ان کے ہاتھوں ہونا ہے''۔

برٹش انڈیا میں پہلے بھی بغاوتیں ہوئی تھیں۔ سب سے بڑی ویلور میں 1806 میں۔ کئی جگہوں پر مسلح مزاحمتیں ہوئی تھیں۔ لیکن تمام برٹش دور میں برٹش سپریمیسی کو اتنا بڑا چیلنج کبھی نہیں آیا۔

کمپنی کے تربیت یافتہ فوجی اور مغلوں کی تعظیم ۔۔۔ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ دینے کے فیصلے نے اس کو انیسویں صدی میں کسی بھی مغربی یورپی ملک کو درپیش سب سے بڑے امتحان میں بدل دیا تھا۔ لیکن بادشاہ کے لئے جو سوال فوری تھا کہ کیا وہ واقعی کنڑول میں ہیں؟ یا انہوں نے صرف اپنی ڈوریاں ہلانے والے بدلے ہیں؟

دہلی میں انقلاب کے دن دو ٹیلی گراف آپریٹروں، برینڈش اور پلکنگٹن نے دفتر بند کیا اور دہلی چھوڑ کر میرٹھ کی راہ لی لیکن جانے سے پہلے انہوں نے دو پیغامات بھجوائے۔ ان کا اوریجنل اس وقت لاہور میں پنجاب آرکائیو میں محفوظ ہے۔ پہلا ’’کینٹونمنٹ محاصرے کی حالت میں‘‘ کے عنوان سے ہے جو دوپہر کو بھیجا گیا۔ اس میں لکھا ہے۔

’’میرٹھ کی تھرڈ لائٹ انفینٹری کے باغیوں نے میرٹھ سے رابطہ کاٹ دیا ہے۔ ان بلوائیوں کی تعداد نامعلوم ہے اور ڈیڑھ سو کے قریب بتائی جا رہی ہے۔ یہ کشتیوں کے پل پر قبضہ حاصل کر چکے ہیں۔ 54ویں نارتھ انفینٹری کو ان سے لڑنے بھیجا گیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا ہے۔ کئی افسر مارے جا چکے ہیں، کئی زخمی ہیں۔ شہر میں نظم و ضبط ختم ہو چکا ہے۔ کچھ فوجی بھجوائے گئے ہیں لیکن ابھی حالات غیریقینی ہیں‘‘

دوسرا پیغام اس سے پہلے بھیجا گیا جب یہ دونوں دفتر چھوڑ کر بھاگنے لگے تھے۔

’’میرٹھ کے سپاہیوں نے سارے بنگلے جلا دئے ہیں۔ وہ صبح یہاں پہنچے تھے۔ ہم یہاں سے اب جانے والے ہیں۔ چارلس ٹوڈ (جو پیغام بھیجنے والوں کے افسر تھے) کو مار دیا گیا ہے۔ وہ صبح نکلے تھے اور واپس نہیں آئے‘‘۔

یہ ٹیلی گراف کی نئی ٹیکنالوجی کا کارنامہ تھا۔ وہ، جسے غالب اس دور کا معجزہ کہتے تھے۔ یہ پیغام انبالہ بھیجا گیا اور چند گھنٹوں میں لاہور، پشاور اور شملہ تک پہنچ چکا تھا۔

کمانڈر انچیف جنرل جارج اینسن کو یہ پیغام ملا تو وہ شملہ میں تھے۔ انہوں نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی ویسے ہی جیسے گولیوں پر چکنائی کے معاملے کو نہیں دی تھی۔ چار دن بعد انبالہ پہنچے تو معاملے کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ اس وقت ہیضے کی وبا بھی پھیلی ہوئی تھی۔ جب 27 مئی کو برٹش انڈیا کے کمانڈر انچیف جنرل اینسن کا انتقال ہیضے کی وجہ سے ہوا تو انقلاب کی یہ لہر بڑھ چکی تھی۔ نوشہرہ، انبالہ، لدھیانہ، فیروزپور، نصیر آباد، ہانسی، مراد آباد، علی گڑھ، آگرہ، مین پوری، ایتاوا، اور آگرہ کے بھی مشرق سے سپاہیوں کے بغاوت کی خبریں آ رہی تھیں۔

نقشے میں یہ مقامات دہلی کے گرد دائرے کی شکل میں نظر آتے تھے۔ جو ہندوستان میں دور دراز تک پھیلے تھے۔ بہادر شاہ اور ان کی مغلیہ سلطنت اب امید کا مرکز تھے۔ بہت سے افراد، گروہ اور بہت سی وجوہات۔ مسلمان بھی، ہندو بھی۔ شمالی انڈیا میں سپاہی اپنے یونٹ کو چھوڑ کر سیدھا دہلی کا رخ کرتے۔ کئی جگہ پرتشدد طریقے سے، قتل و غارت کرتے اور کئی بار افسروں سے معذرت کرتے ہوئے۔

کمانڈر رچرڈ بارٹنر نے نقشے پر یہ پیٹرن دیکھتے ہوئے کہا کہ ’’بغاوت کا یہ نقشہ مکڑی کے جالے کی طرح ہے۔ اس کا مرکز دہلی ہے اور اس کے بیچوں بیچ پر جو مکڑا بیٹھا ہے، وہ بہادر شاہ ظفر ہے‘‘۔
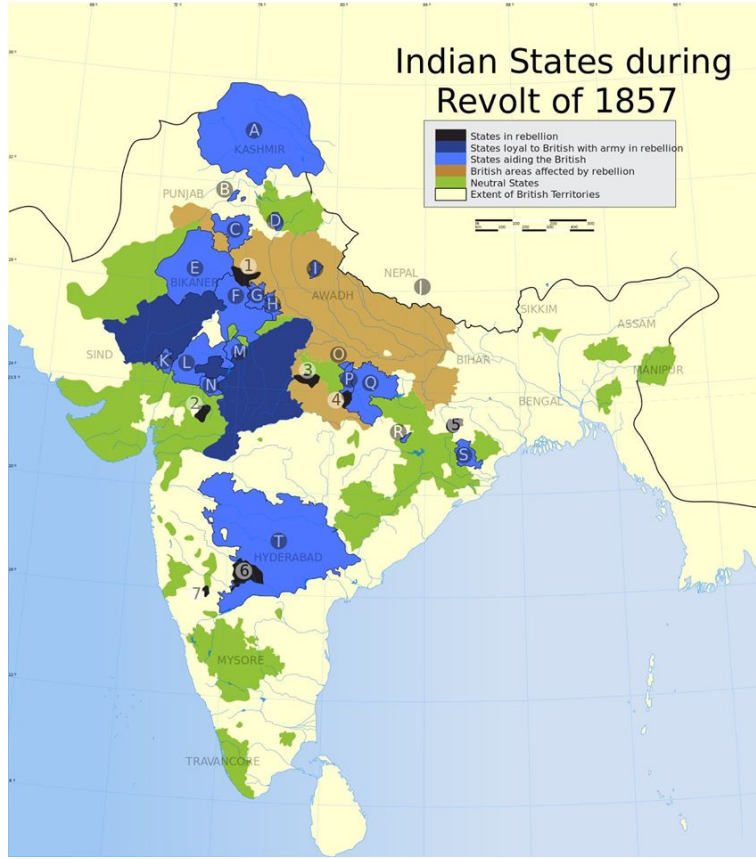
شکل 13: بغاوت کا نقشہ

ساتھ لگی تصویر میں بغاوت کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ ہلکے نیلے میں وہ علاقے جہاں پر مقامی حکمران ایسٹ انڈیا کمپنی کی باقاعدہ طور پر مدد کی گاڑھے نیلے میں وہ علاقے جہاں کے حکمران کمپنی کے وفادار رہے۔ سیاہ میں وہ علاقے جہاں کے حکمرانوں نے بغاوت میں حصہ لیا۔ سبز میں وہ، جہاں کے حکمران غیر جانبدار تھے۔ بھورے رنگ میں وہ علاقے جہاں کمپنی کی براہِ راست حکومت تھی لیکن بغاوت میں عملداری ختم ہو گئی۔ پیلے رنگ میں وہ علاقے جہاں کمپنی کی براہِ راست حکومت تھی اور یہاں پر موثر بغاوت نہیں ہوئی۔

آزادی کے بعد

انقلاب کا مقابلہ کرنے سب سے موثر جواب لاہور اور پشاور سے آیا۔ لاہور میں جان لارنس ایک اچھے منتظم تھے اور پشاور کے جان نکلسن اور ہربرٹ ایڈورڈز سخت گیر فوجی۔ انہوں نے فوری جواب کا منصوبہ بنایا۔ ""ہمیں فوری حرکت میں آنا ہو گا۔ اب وقت ان سپاہیوں کے شکوے دور کرنے کا نہیں رہا۔ اب انہیں کچل دینے کا وقت ہے۔ اور جتنا جلد یہ خون بہایا جائے گا، اتنا ہی کم خون بہانا پڑے گا"۔ ایڈورڈز نے یہ پیغام لارنس کو بھیجا۔ چار روز میں جہلم میں یہ عسکری کالم تیار تھا جو سبک رفتاری سے کسی بھی سمت بغاوت کچلنے جا سکتا تھا۔

نکلسن ایک سخت مزاج افسر تھے اور راولپنڈی کے کمشنر کے طور پر انہوں نے اس کا سرِعام مظاہرہ دکھایا بھی تھا۔ ایک بدنام ڈاکو کو جب انہوں نے پکڑا تھا تو اس کا سر اتار کر اپنے میز پر سجایا تھا۔ وہ سخت محنت کرنے میں بھی اور کروانے میں بھی شہرت رکھتے تھے۔ مقامی آبادی میں کچھ لوگوں میں بہت پسند بھی کئے جاتے تھے لیکن خود مقامی لوگوں کو ناپسند کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ""دنیا میں ہندوستانیوں سے زیادہ گندی اور ظالم ایک ہی قوم ہے اور وہ افغان ہیں"۔ اٹک پر قبضے میں ان کی شجاعت کی داستانوں کا چرچا تھا۔ وہ کسی کو قیدی بنانے کے قائل نہیں تھے۔

ان کے ارادے زیادہ خون آشام تھے جو انہوں نے دوسرے برطانوی افسروں سے اس وقت شئیر نہیں کئے۔ دہلی کے قتلِ عام کے بعد پشاور کے کمانڈروں نے یہ بل پیش کیا۔ ""برٹش خواتین اور بچوں کو دہلی میں مارنے والوں کے لئے پھانسی کی سزا ناکافی ہے۔ ان کو لٹا کر کوڑے مارے جائیں، مصلوب کیا جائے اور جلا دیا جائے۔ لٹکا دینا انصاف نہیں۔ ان پر بدترین تشدد کیا جانا چاہیے تا کہ ہمارے ضمیر سے بوجھ اتر سکے"۔

اسی طبیعت کے ایک اور افسر ولیم ہوڈسن تھے جو انٹیلی جنس کے بے رحم چیف تھے۔ انہوں نے فوری طور پر جاسوسی کے لئے مولوی رجب علی کو دہلی روانہ کیا۔ رجب کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ وہ ہیڈ منشی کا کام کرتے رہے تھے اور پنجاب میں پولیٹیکل ایجنٹ بھی رہ چکے تھے اور ہنری لارنس کے ساتھ کام کرتے تھے۔

مولوی رجب علی جلد دہلی پہنچے اور مخبروں اور جاسوسوں کا بڑا اور موثر نیٹ ورک بنانے میں کامیاب رہے۔ اس نیٹورک میں ہندو بنئے بھی تھے اور مغل اشرافیہ کے لوگ بھی۔ برٹش راج پسند کرنے والے عام شہری بھی اور انقلابیوں کو ناپسند کرنے والے بھی۔ رجب علی کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ اپنے نیٹ ورک میں اہم ترین انقلابی کمانڈروں کو بھی بھرتی کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہریانہ ریجیمنٹ کے بریگیڈ میجر غوری شنکر سوکل جن سے برٹش فوج تک حکمت عملی مسلسل پہنچتی رہی اور دوسرے سپاہی جو نہ صرف معلومات پہنچاتے رہے بلکہ وقت ملنے پر انقلابیوں کے پروگرام میں خلل ڈالتے رہے۔ رجب علی جلد ہی ملکہ عالیہ زینت محل سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور بہادر شاہ ظفر کے وزیر اعظم حکیم احسن اللہ خان کو ساتھ ملا لیا اور شاہی محل میں پرو برٹش دھڑے کے سربراہ، مرزا فخرو کے سسر اور بہادر شاہ ظفر کے سمدھی مرزا الٰہی بخش کو۔ اس انٹیلی جنس نیٹ ورک کو قائم کر لینے کی کامیابی جنگ میں بہت اہم رہی۔ ان کے بھیجے گئے نوٹ فقیروں اور سادھوؤں کے بھیس میں ایجنٹ لے کر جاتے تھے اور ان میں سے ہزاروں رقعے ابھی بھی نیشنل آرکائیو آف انڈیا میں محفوظ ہیں۔ یہ بہت چھوٹی لکھائی میں جوتوں یا کپڑوں میں اڑس لئے جاتے تھے۔ ان میں شہر کے حالات، توپوں کی پوزیشن، اسلحے کی صورتحال، سپاہیوں یونٹس کے درمیان اختلافات، اندرونی مسائل بتائے جاتے تھے۔

جاسوسوں سے آنے والی انفارمیشن نہ قابلِ اعتبار ہوتی تھی اور نہ ایکوریٹ۔ اکثر انفارمیشن کے دام ادا کرنے والوں کو وہ بتایا جاتا تھا جو وہ سننا چاہتے تھے۔ لیکن اگلے مہینوں میں اتنی انفارمیشن برٹش تک پہنچتی رہی کہ اس نے اس لڑائی کو طے کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔ اس کے مقابلے میں انقلابیوں کے پاس کوئی طریقہ نہیں تھا کہ انہیں اپنے مخالفین کے بارے میں کچھ بھی پتا لگتا۔

جون کے پہلے ہفتے میں جی ٹی روڈ سے جنرل ہنری برنارڈ کی قیادت میں تین ہزار فوجی جی ٹی روڈ پر دلی کی طرف رواں دواں تھے۔ ان کے ساتھ پچاس توپیں اور فیلڈ گن تھیں۔

ہوڈسن نے پٹھان اور پنجابی رضاکاروں کو کامیابی سے بھرتی کر لیا تھا جو بغاوت کر کے چھوڑ جانے والے ہندوستانی فوجیوں کی جگہ لے چکے تھے۔ نکلسن اور ہوڈسن ملکر پوری قوت سے برٹش غصہ بہادر شاہ کے نئے آزاد ہونے والے دہلی پر اگلنے والے تھے۔ مزید رضاکاروں کی بھرتی جاری تھی۔

نئے آزاد ہونے والے دہلی میں حالات اچھے نہ تھے۔ لاء اینڈ آرڈر باقی نہیں رہا تھا۔ لوٹ مار جاری تھی۔ تاوان کے لئے لوگوں کو پکڑا جاتا تھے۔ نئے آنے والے سپاہیوں کی رہائش کی جگہ نہیں تھی۔ بہت سوں نے محل کے دالانوں میں بسیرا جمایا تھا۔ کئی نے لوگوں کی کوٹھیوں میں۔ سپاہیوں اور دہلی والوں کے درمیان جھڑپیں ہوتی تھیں۔ جو کرسچن شہر سے نکلنے سے رہ گئے تھے، اگلے دنوں میں انہیں مارا جاتا رہا۔ دہلی کالج کے پرنسپل فرانسس ٹیلر کی باری بارہ مئی کو آئی تھی۔ لیکن شہر میں کہیں سے متحد نظر نہیں آتا تھا۔ کئی لوگوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر پرانی دشمنیاں نپٹانا شروع کر دی تھیں۔

محفوظ میوٹنی پیپرز میں عام شہریوں کی عرضداشتیں نظر آتی ہیں جو بادشاہ سے بچاؤ کی درخواست دے رہے تھے۔ ان میں خاص طور پر شہر کے عام لوگ تھے جن کے پاس حفاظت کے لئے مسلح گارڈ یا حویلیاں یا اونچی دیواریں نہیں تھیں۔ غریب لوگ، خاص طور پر کشن گنج اور نظام الدین میں ان جرائم سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ پہاڑ گنج اور جے سنگھ پورہ کے لوگ شاہی محل دہائی دینے پہنچے تھے کہ "تلنگے ہماری چارپائیاں، برتن اور آگ جلانے والی لکڑیاں تک اٹھا کر لے گئے ہیں"۔ ایک اور وفد تاجروں کا آیا تھا کہ ان کے سٹاک اٹھا لئے گئے ہیں۔

شہر سے باہر صورتحال زیادہ بری تھی۔ برٹش پولیس سسٹم نے امن قائم کیا تھا، وہ ختم ہو گیا تھا۔ گوجر اور میواتی قبائل کے نیم خانہ بدوش لوگوں کو لوٹنے کے لئے پھر رہے تھے۔ یہاں تک کہ بہادر شاہ ظفر نے الور کے راجا کو مدد طلب کرنے جو ہرکارے بھیجے، وہ گجروں کے ہاتھوں اپنے گھوڑے، پیسے اور کپڑے تک گنوا کر واپس پہنچے تھے۔ بادشاہ کے خط کے پرزے کر کے ان کے ہاتھ میں پکڑا دئے گئے تھے۔

ان گھومتے پھرتے لٹیروں نے دہلی کی جنگ میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ برٹش دہلی کا محاصرہ نہیں کر سکے تھے جبکہ لٹیروں نے عملی طور پر شہر کی سپلائی کاٹ دی تھی۔

بہادر شاہ ظفر نے اپنا چاندی کا تخت نکلوا کر قلعی کروا کر دیوانِ خاص میں لگوایا تھا۔ یہ تخت پندرہ سال سے سٹور میں پڑا تھا۔ ہاتھی پر سوار امن و امان قائم کرنے کی اپیل کرنے ہات شہر میں نکلے۔ شہزادہ مرزا مغل خود تمام پولیس سٹیشنوں پر گئے اور حکم جاری کروایا کہ جو کوئی لوٹ مار کرتے پکڑا گیا، اس کے ناک اور کان کاٹ دئے جائیں گے"۔

اس شام کو عام دربار لگایا اور خوبصورت زبان میں فارسی روبکاری جاری کی جس نے سپاہیوں کے تمام صوبیداروں کو کہا گیا کہ وہ اپنے آدمیوں کو کنڑول کریں۔ افسروں نے احترام سے یہ سنا لیکن ایک گھنٹے کے اندر اندر دربار میں ہنگامہ برپا تھا۔ سپاہی شکایت کر رہے تھے کہ ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں اور دکاندار اپنے دکانیں کھول نہیں رہے۔ بادشاہ ان کے کھانے پینے کا بندوبست کریں۔

جلد ہی یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ بہادر شاہ ظفر جنگ کے لیڈر کے طور پر موزوں نہیں۔ بیاسی سال کی عمر میں ان کے پاس وہ توانائی، ولولہ، جوش و جذبہ نہیں تھا جو انقلاب کے منہ زور شیر پر سواری کے لئے درکار ہوتا ہے۔

وہ اپنے دیوانِ عام کو سپاہیوں کی رہائش بنانے سے اور انہیں محل کے زنانے میں تاک جھانک کرنے سے بھی نہیں روک سک رہے تھے۔ انہوں نے سپاہیوں کے گھوڑوں کو اپنے پسندیدہ باغوں سے ہٹوانے کی کوشش کی تھی جو کامیاب نہیں رہی تھی۔

تیرہ مئی کو ظفر نے شہر میں امن و امان لانے کے لئے پھر کوشش کی۔ شہر میں کئی جگہ لگائی گئی آگ سلگ رہی تھی۔ کوتوال سے دو سے تین سو سقوں کو انہیں بجھانے کا حکم جاری کیا۔ روز دہلی میں تین سے چار سو نئے سپاہی پہنچ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ہندوستان بھر سے سات سے آٹھ ہزار سپاہی دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں، ‘‘سپاہی آسائش میں رہ رہے تھے، بہت سے بھنگ پیتے رہتے، لڈو پیڑے، پوریاں، کچوریاں اور مٹھائیاں کھاتے اور چین کی نیند سوتے۔ دہلی ان کے پاس تھا اور جو چاہے کرتے۔ اندھیر نگری، چوپٹ راج تھا۔ عام لوگ اس سب سے جلد ہی تنگ آ چکے تھے اور دعا کر رہے تھے کہ خدا اس سے نجات دلوائے اور حکومت واپس بحال ہو۔ باغی سپاہی اور شہر کے بدمعاش روز لوٹ مار کرتے امیر ہو رہے تھے۔ کچھ کے پاس تو لوٹا مال کہیں رکھنے کی جگہ بھی نہیں رہی تھی۔ عام لوگ فاقہ زدگی کا شکار تھے۔ روزگار ختم ہو گیا تھا اور کاروبار بند پڑے تھے’’۔

بہادر شاہ ظفر کو ظلِ الٰہی، شہنشاہِ عالم، خلفیہ وقت، بادشاہوں کا بادشاہ، سلطانوں کا سلطان کہا جاتا۔ صادق الاخبار کے مطابق، ‘‘ہم خدا کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ظالموں سے نجات دلوائی اور ظلِ الٰہی کو بحال کروایا’’۔ اس لاقانونیت اور انارکی کے پسِ منظر میں مغل دربار نے، اپنی تمام تر کمزوریوں کے ساتھ، ایک مرکزی اور سیاسی اہمیت کا کردار سنبھالا۔ 1739 کے بعد سے، جب نادر شاہ نے دہلی کو اجاڑا تھا، پہلی بار روزانہ دربار لگنے لگا۔

لیکن شاہی خاندان خود منقسم تھا۔

شکل 14: لال قلعہ

محلاتی سیاست

شاہی محل میں پانچ شہزادے ۱۸۵۷ کے انقلاب کے پرجوش حمایتی تھے۔ انہیں اپنے مستقبل کی امید نہیں رہی تھی اور انہوں نے قسمت کے دیے گئے اس موقع کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ ان پانچ میں سے چار اس سے پہلے گمنام رہے تھے اور خاص صلاحیتوں کے مالک نہ تھے۔

تئیس سالہ مرزا خضر سلطان بہادر شاہ ظفر کے نویں بیٹے تھے اور حرم کی ایک خاتون رحیم بخش بائی سے تھے۔ ان کا ریکارڈ میں ایک واقعہ ملتا ہے جب انہوں نے اپنی بیوی کو پیٹا تھا اور اس وجہ سے بھرے دربار میں ظفر نے ان کی سختی سے سرزنش کی تھی اور دو تین تھپڑ لگائے تھے۔ خضر سلطان نے بادشاہ کے قدموں میں گر کر معافی مانگ تھی اور بادشاہ نے انہیں اپنی بیوی سے اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا تھا۔ اچھے شاعر اور نشانہ باز تھے۔

دوسرے مرزا ابوبکر تھے جو ظفر کی جائز اولاد میں سب سے بڑے پوتے اور سابق ولی عہد مرزا فخرو کے بیٹے تھے۔ ان کا اس سے پہلے ریکارڈ میں صرف ایک ہی واقعہ ملتا ہے جس میں ایک حادثے میں ایک انگلی کٹ گئی تھی۔ اس انقلاب کے دوران ان کا طرزِ عمل اچھا نہیں رہا اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خواتین اور شراب کے چکر میں رہتے تھے اور نوکروں اور چوکیداروں کو پیٹتے تھے۔

تیسرے شہزادے مرزا بختاور شاہ تھے جو ظفر کے گیارہویں بیٹے تھے جو حرم کی خاتون ہنوا سے تھے۔ چوتھے مرزا عبداللہ تھے جو ظفر کے سب سے بڑے بیٹے کے بیٹے تھے۔

لیکن پانچویں شہزادے ان سب سے مختلف تھے اور انہوں نے جلد ہی خود کو سول ایڈمنسٹریشن کے سربراہ کے طور پر منوا لیا۔ یہ بہادر شاہ ظفر کے پانچویں بیٹے 29 سالہ مرزا مغل تھے۔ انقلاب سے پہلے بھی ان کا ذکر بہت ریکارڈز میں ملتا ہے۔ ان کے پاس قلعہ دار کا عہدہ تھا اور شاہی ملازمین کو تنخواہیں دینا اور کنٹرول کرنا ان کی ذمہ داری تھی۔ ان کی دو تصاویر بھی محفوظ ہیں۔ اس میں ہینڈسم اور ایتھلیٹک نوجوان، گہرا رنگ، بھوری آنکھیں اور سیاہ داڑھی۔ اگر ظفر کی شخصیت تحمل والی، ٹھہری ہوئی، جوش سے خالی اور فیصلہ لینے میں تاخیر والے معمر شخص کی نظر آتی ہے تو یہ اس کا بالکل

ہی معکوس تھے۔ بے صبرے، غصے والے، دنیادار، پرجوش اور کچھ تلخ مزاج۔

بارہ مئی کی صبح شہزادے بادشاہ کے پاس آئے اور ان سے فوج کی کمانڈ کی اہم عہدوں کی درخواست کی۔ پہلے یہ مسترد کر دی گئی۔ بادشاہ نے کہا کہ ''تم لوگ کرو گے کیا؟ تمھیں اس کا تجربہ نہیں'' لیکن اصرار کرنے پر پندرہ مئی کو یہ قبول کر لی گئی۔ سپاہیوں کی حمایت کے بعد مرزا مغل کو انقلابی فوج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا۔

میوٹینی پیپرز میں بڑی حیران کن بات ملتی ہے جو تاریخ سے غائب ہے، وہ مرزا مغل اور ان کا فعال کردار ہے۔ ہزاروں احکامات ہیں جو ان کی طرف سے جاری ہوئے۔ پیپرز کی کلکشن 60 میں صرف انہی کے جاری کردہ احکامات ہیں جن کی تعداد 831 ہے۔

تاریخ میں، خواہ کسی کی بھی لکھی ہو، ایسا تاثر دیا جاتا ہے کہ مغل شہزادے سست اور نکمے تھے۔ مرزا مغل کو ایک بے کار ارسٹوکریٹ سمجھا جاتا ہے۔ تاریخی ریکارڈ اس تاثر کی نفی کرتا ہے۔ مرزا مغل انقلابیوں میں سب سے زیادہ محنتی اور متحرک نظر آتے ہیں۔ انہوں نے دہلی میں کسی حد تک تنظیم اور باقاعدہ انتظامیہ مہیا کی۔ اگرچہ کہ بحران کو کنٹرول کرنے کی کوشش میں، باغی سپاہیوں اور فری لانس جہادیوں کو متحد فورس بنانے اور ان کے اختلافات کو کنٹرول کرنے میں ناکام رہے۔ لیکن اس ناکامی کی وجہ محنت اور کوشش کی کمی نہیں تھی۔

سپاہیوں کو شہریوں سے دور رکھنے، ان کے لئے قائم کردہ ملٹری کیمپ، پولیس کو بازاروں میں لوٹ مار کو کنٹرول کرنے کی ہدایات، سپاہیوں کو تنخواہ کی ادائیگی کے وعدے، پیسے اکٹھا کرنے کی کوشش، سپاہیوں اور دہلی والوں کو خوراک کی سپلائی بحال کرنے کی کوشش، انفرادی لوگوں کی عرضیوں پر ایکشن۔ کدالوں، بیلچوں، کلہاڑیوں اور ریت کے تھیلوں کا بندوبست کر کے ان سے خندق بنانے اور دفاعی کام کروانا، ملٹری کے لئے سخت ڈسپلن کے احکامات ۔۔ جیسا کہ گھر کی تلاشی بغیر پرمٹ کے نہیں کی جا سکتی۔ گوجر قبائل سے مذاکرات تا کہ شہر کے باہر راستے محفوظ بنائے جا سکیں۔ بہادر شاہ ظفر کی تصویر والے سکے جاری کرنے والی ٹکسال کا قیام اور اپنے والد کی حمایت پر لوگوں کو اکٹھا کرنا اور اپنے بھائیوں کو کنٹرول میں رکھنا۔ یہ ان جاری کردہ کاغذات میں دکھائی دیتا ہے۔

مرزا مغل نے ایک خط ہندوستان کے نوابوں اور راجاؤں کے لئے لکھا کہ وہ اس انقلاب میں ان سے وفاداری دکھائیں۔ ستی کی رسم پر انگریز سرکار کی لگائی جانے والی پابندی، مذہب تبدیل کرنے پر عاق کر دینے پر پابندی، جیلوں میں کرسچن مبلغین کی موجودگی کا ذکر الگ الگ خاص طور پر کیا گیا۔ ''انگلش ہم سب کے مذاہب کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر انہیں اپنا کام جاری رکھنے دیا گیا تو وہ ہمارے دھرم ختم کر دیں گے۔ یہ ہندو اور مسلمان کے برابر دشمن ہیں اور ہمیں اکٹھا ہو کر ان کا صفایا کرنا ہے۔ اس طرح ہم اپنی جان اور اپنا ایمان بچا سکیں گے''۔

مورخین کو لال قلعے سے جاری کردہ ایک اور دستاویز ملی جو ہر لحاظ سے ماڈرن دستاویز کہی جا سکتی ہے، جس میں معاشی اور سماجی مسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ زمینداروں پر ٹیکس، سرکاری ملازمین کے مسائل، فوجی بھرتیاں اور برٹش درآمدات کی وجہ سے مقامی ہنرمندوں کی بیروزگاری کا۔ مذہبی، سیکولر، سیاسی، عوامی ۔۔۔ مرزا مغل کسی مشاق سیاستدان کی طرح ہر طریقے سے سپورٹ جیتنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ملکہ زینت محل اور ان کے بیٹے مرزا جوان بخت نے دوسرا راستہ چنا۔ زینت محل اپنے شوہر کے انقلابی افواج کی حمایت کے فیصلے سے نالاں تھیں۔ ان سے شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ بادشاہ نے کسی اہم بات پر ان کے مشورے کے خلاف عمل کیا تھا۔ ملکہ نے شاید اندازہ لگا لیا تھا کہ برٹش واپس آ جائیں گے اور سپاہیوں کو شکست ہو گی۔ اور اگر اس وقت برٹش سے وفاداری دکھائی جائے تو ان کے بیٹے کو اگلے بادشاہ بنایا جا سکے گا۔

محل میں اب دو دھڑے بن گئے تھے۔ پرو برٹش سائیڈ پر زینت محل کے علاوہ ظفر کے وزیرِ اعظم حکیم احسن اللہ، سمدھی الہی بخش، متعمدِ خاص محبوب علی خان بھی تھے۔

ظفر ان کے درمیان ایک مشکل صورتحال میں تھے۔ سپاہیوں کے خطرے سے بھی واقف تھے۔ ان کے طور طریقوں سے بھی خوش نہیں تھے اور لوٹ مار سے بھی نالاں تھے لیکن دوسری طرف، انہیں معلوم تھا کہ تیمور کے گھرانے کو بچانے کا موقع یہی تھا۔ یہ انقلاب ان کے خاندان کی بادشاہت بچا سکتا تھا جس کی وہ کوشش بیس برسوں سے کرتے رہے تھے لیکن اس سے پہلے تک امید چھوڑ چکے تھے۔

شکل 15: ”مرزا مغل“ جن کا اس جنگ میں کلیدی کردار رہا۔

اور پھر وہ واقعہ ہو گیا جس نے بہادر شاہ ظفر کے لئے واپسی کا کوئی بھی راستہ بند کر دیا۔ یہ انقلابیوں کی طرف سے شاہی محل میں حفاظت میں رکھے گئے 52 شہریوں کا کیا گیا بہیمانہ قتل تھا۔

نازک صورتحال

شہر کے کوتوال معین الدین نے 52 انگریز شہریوں کو محفوظ رکھنے کے لئے حراست میں لیا تھا اور انہیں شاہی محل میں رکھا تھا۔ یہ ان کی جان بچانے کے لئے کیا گیا تھا۔ سپاہیوں کو جب بھنک پڑی تو انہوں نے حکیم اور خواجہ سرا پر الزام لگایا کہ یہ انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں اور اس وجہ سے ان کی جان بچانا چاہ رہے ہیں۔ قیدیوں کو شاہی قید خانے سے نکال کر لاہور دروازے کے پاس لے جا کر نوبت خانے کے میدان میں پیپل کے درختوں سے باندھ دیا گیا اور ان پر آوازے کسے جانے لگے۔ انہیں ذبح کرنے کی تیاری ہونے لگی۔

بادشاہ اور درباری ششدر کھڑے تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ آخر بادشاہ نے سپاہیوں کو حکم دیا، ''مسلمان الگ ہو جائیں اور ہندو الگ۔ اور جا کر اپنے اپنے مذہبی راہنماوں سے جا کر پوچھیں کہ کیا بےبس مردوں، خواتین اور بچوں کو ذبح کر دینے کا انہیں کوئی اختیار ہے؟ اس طریقے سے قتل کی اجازت نہیں دی جا سکتی''۔ سعید مبارک شاہ لکھتے ہیں کہ ''بحث بڑھتی گئی۔ پھر بادشاہ رو پڑے اور کہا کہ اگر یہ ظلم کیا گیا تو خدا کا قہر ہم پر نازل ہو گا۔ کوئی بے قصوروں کو بھی اس طرح مارتا ہے؟ لیکن انقلابیوں نے ایک نہ سنی اور کہا کہ ہم انہیں قتل کریں گے اور آپ کے محل میں ہی کریں گے خواہ کچھ بھی ہو اور پھر ہم اور آپ انگریز کی نظر میں اس میں برابر کے قصوروار ہوں گے''۔

بات اتنی بڑھ گئی کہ حکیم احسن اللہ نے کہا کہ ''اگر یہ ہونے دیا گیا تو انگریز دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے لیکن ان جذباتی لوگوں کے آگے عقل استعمال کی گئی تو وہ نہ انہیں زندہ چھوڑیں گے، نہ ہمیں اور نہ بادشاہ کو''۔

قیدیوں کو بٹھا کر گولیوں اور تلواروں سے مار دیا گیا اور لاشوں کو بیل گاڑیوں میں بھر کر دریا میں بہا دیا گیا۔ یہ واقعہ دہلی والوں کے لئے شدید بے چینی کا باعث بنا۔ دہلی اخبار نے تجزیہ دیا، ''ان پوربیوں کے بھیانک ظلم کی وجہ سے ہم انگریز سے جیت نہیں پائیں گے''۔

ظفر کے لئے یہ قتلِ عام ایک ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ سپاہیوں نے درست اندازہ لگایا تھا کہ برٹش اس کا انتقام لینے آئیں گے اور شاہی محل میں ہونے والے اس قتلِ عام کا ذمہ دار شاہی خاندان ٹھہرایا جائے گا۔ اس کو روکنے میں ناکامی نے بہادر شاہ ظفر کے لئے واپسی کا راستہ بند کر دیا تھا اور ان کے خاندان کو ختم کرنے کی مہر لگا دی تھی۔

سپاہیوں کے آپس کے جھگڑے بھی معمول تھے۔ میرٹھ کے سپاہی اور دہلی کے سپاہیوں میں جھڑپیں ہو جاتی تھیں۔ اخبار کا تراشہ، ''ہر کوئی بے بس ہے۔ کئی لوگ فاقہ زدگی کا شکار ہیں۔ شہر کے کوتوال کی ہر کوئی تعریف کرتا ہے لیکن ان تلنگوں کو قابو کون کرے۔ دو کام بہت اہم ہیں۔ تنخواہوں کی ادائیگی اور تلنگوں کو لگام دینا''۔

انیس مئی کو ایک نئی تقسیم ابھر آئی۔ قدامت پرست مولوی محمد سید نے جامعہ مسجد میں خطبہ دیا اور کہا کہ یہ صرف مسلمانوں کا جہاد ہے اور اس کا پوسٹر لگوا دیا۔ ظفر نے اس کو اتروا دیا کہ یہ ہندوؤں کو غصہ دلائے گا۔ اگلے روز مولوی محمد سید اپنے گروپ کے ساتھ شاہی محل میں آ گئے کہ ہندو انگریزوں کے حمایتی ہیں اور ان کے خلاف بھی جہاد فرض ہے۔ محل میں ہندو اور مسلمانوں کی گرما گرم شروع ہو گئی۔ بہادر شاہ ظفر نے خاموش کروا کر کہا کہ ان کی نظر میں ہندو اور مسلمان برابر ہیں اور یہ خیال صرف حماقت ہے۔ پوربی سپاہیوں کی اکثریت ہندو ہے اور دہلی میں خانہ جنگی شروع نہیں کی جا سکتی۔ جہاد انگریز کے خلاف ہے۔ ہندو کے خلاف نہیں۔

اس موقع پر تو ظفر جہادیوں کو خاموش کروا کر واپس بھیجنے میں کامیاب رہے لیکن آٹھ ہفتے بعد جب شمالی ہندوستان سے آنے والے مجاہدین کے بڑی تعداد شہر میں اکٹھی ہو چکی تھی، ان کے لئے یہ روکنا بہت مشکل ہو جانا تھا۔

برٹش آرمی کے لئے دہلی پر پیشقدمی آسان نہیں رہی۔ فوج کو اکٹھا کرنے، لڑنے والے سپاہی ڈھونڈنے اور پلان بنانے میں دشواری رہی۔ لیکن 30 مئی کو ہندان پر برٹش فوج پہنچ چکی تھی جہاں پہلی لڑائی لڑی گئی۔ مرزا ابو بکر کی قیادت میں دریا کے پُل پر یہ جھڑپ ہوئی۔ اگرچہ برٹش نے مغل فوج کو پسپا کر دیا لیکن انہیں اندازے سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ جنرل ولسن خود اس جھڑپ میں بمشکل زندہ بچے۔ پہلی جون کو جنرل برنارڈ کی قیادت میں گورکھا فوج ان سے آن ملی۔ ان تک دہلی میں ہونے والے قتلِ عام کی خبر مزید مبالغہ آرائی کے ساتھ پہنچی اور برٹش غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ مقامی لوگوں کے ساتھ سفاکی سے سلوک ہونے لگا۔ ہیریٹ ٹٹلر لکھتی ہیں، ''میں نے سفید کپڑوں میں ملبوس ایک نانبائی کو درخت سے پھانسی لگے دیکھا۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے ناشتہ دیر سے پہنچایا تھا''۔

مرزا مغل نے وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ دہلی کے قلعے کی دیواروں کی مرمت کر دی گئی تھی۔ سلیم گڑھ میں آرٹلری نصب ہو چکی تھی۔ توپیں دیوار پر پہنچ چکی تھیں۔ دفاعی تعمیرات زور و شور سے کی جا رہی تھیں۔ دہلی کے شمال میں جی ٹی روڈ پر پرانی کاروان سرائے میں دفاعی پوزیشن متاثر کن تھی۔ دونوں اطرف میں دلدلی علاقے کے بیچ آرٹلری کی لائن اور مغرب میں پہاڑی۔ یہ ایک بہترین عسکری دفاعی پوزیشن تھی۔ مغل توپوں کا سامنا کئے بغیر یہاں سے نہیں گزرا جا سکتا تھا۔

یہ وہ مقام تھا جہاں برٹش فوج نے اہم معرکے میں کامیابی سے لڑائی لڑی اور مغل توپوں پر قبضہ کر لیا اور یہ اس جنگ کا بہت اہم واقعہ تھا۔ سات جون کو صبح ساڑھے چار شروع ہونے والی یہ جھڑپ شام پانچ بجے تک جاری رہی اور یہ علاقہ برٹش کے پاس تھا۔ ظہیر دہلوی بیان کرتے ہیں، ''سڑک خون سے تر تھی۔ جیسے ہولی میں کسی نے سرخ رنگ پھینکا ہو۔ مجھے سپاہی سوار نظر آئے جن کے سینے پر گولی لگی تھی۔ آنتیں نکلی پڑی تھیں۔ ایک ہاتھ پستول پر، ایک گھوڑے کی رکاب پر۔ چہرہ ایسے جیسے تکلیف کا نشان نہ ہو۔ میں آج تک حیران ہوتا ہوں کہ انسان اتنا زخمی ہو کر زندہ کیسے رہ سکتا ہے چہ جائیکہ میدان سے چار میل دور سواری بھی کر کے آ گیا ہو۔ میں نے ایک اور فوجی کو دیکھا جو گھوڑا تیز دوڑا رہا تھا۔ اس کے زخم سے خون ایسے ابل رہا تھا جیسے فوارہ چھوٹ پڑا ہو۔ اس کے پیچھے ایک اور جس کا بازو کٹ گیا تھا۔ میں نے بہت سے زخمی دیکھے جو کیمپ ہسپتال کی طرف جا رہے تھے''۔

سات جون کو جنرل ولسن کی فوجیں دہلی سے آٹھ میل دور علی پور کے کیمپ میں پہنچ چکی تھیں۔ اس سے اگلے روز برطانوی پوزیشنوں سے گولے برسنا شروع ہو گئے۔ دہلی اب حملے کی زد میں تھا۔ دہلی سے جواب فوری آیا۔ موثر اور ایکوریٹ۔ برٹش پوزیشنوں کو نشانہ بنایا جانے لگا۔ یہ برٹش کے لئے غیر متوقع تھا۔ جان ایڈورڈ روٹن کے مطابق، ''ہمیں اب احساس ہوا کہ دہلی کو اتنی فوج سے فتح کرنے کا خواب دیوانگی تھی۔ ہم دہلی کا محاصرہ کرنے آئے تھے۔ ہمیں جلد ہی سبق مل گیا کہ حقیقت میں ہم محاصرہ کرنے والے نہیں، بلکہ خود محصور تھے''۔

دہلی پر قبضے کی باقاعدہ جنگ شروع ہو چکی تھی۔

شکل 16: شاہی محل کا نوبت خانہ۔ محل میں اس جگہ پر کئے گئے 52 شہریوں کے قتلِ عام کا قصوروار بہادر شاہ ظفر کو ٹھہرایا گیا۔

جنگ شروع ہوئی

دس جون کو دہلی پر گولہ باری شروع ہو گئی۔ یہ گولے کسی گھر پر گرتے، کسی بازار میں، کسی دیوار کو توڑ دیتے۔ شاہی محل اور انتظامی مراکز کو نشانہ بنائے جانے کی کوشش تھی۔ حوض کے کنارے بیٹھے بادشاہ کے قریب گرنے والے گولے میں وہ بال بال بچے۔ شہریوں کے حوصلے پست پڑ رہے تھے۔ دہلی والے، خواہ انگریزوں کے حامی یا خلاف اب محسوس کر رہے تھے کہ وہ کسی پنجرے میں بند چوہے ہوں جس کے پاس کوئی راہِ فرار نہ ہو۔

غالب اس وقت کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''کبھی دلی میں شرفاء اور معززین روشن محفلوں میں بیٹھا کرتے تھے۔ گلاب کی مہک سے معطر محفلیں سجا کرتی تھیں۔ اب اندھیرا ہے اور مصیبت کے شعلے۔ شہر کی خوبصورت عورتیں بھی چوروں اور لٹیروں سے بے عزتی کے خوف سے گھروں میں بند ہو گئی ہیں۔ ہمیں ان بدمعاشوں کے ہاتھ مصیبت جھیلنا ہے۔ ڈاک بھی بند ہو گئی۔ نہ خط وصول کئے جا سکتے ہیں اور نہ بھیجے جا سکتے ہیں۔ اب دن رات توپوں کی گھن گرج چلتی ہے۔ چراغوں میں ڈالنے کے لئے تیل نہیں رہا۔ رات کو گھپ اندھیرا ہوتا ہے اور اس اندھیرے میں توپ کی روشنی میں ہی پانی پینے کے لئے گلاس ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ بہادر لوگ بھی اس انتشار میں خوفزدہ ہیں۔ اپنے سائے سے ڈر لگنے لگا ہے''۔

عام شہریوں کے لئے مسائل اس سے زیادہ تھے۔خوراک کا مسئلہ پیدا ہو چکا تھا۔ مہنگائی تیزی سے بڑھنے لگی تھی۔ اور اس سے لاقانونیت میں مزید اضافہ ہوا تھا۔

لیکن اس کے باوجود شہر میں اعتماد تھا۔ برٹش کی واپسی شہر والوں کے لئے شاک کا باعث تھی لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ اتنے طاقتور نہیں اور جلد شکست سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ نگاہیں اب سپاہی دستوں پر جمی تھیں کہ وہ انگریز افواج کو ان کے کیمپ سے نکالنے میں کامیاب ہو جائے گے لیکن جیسا ابتدائی کوششوں سے پتا لگا ۔۔۔ یہ اتنا آسان نہیں تھا جتنا لگ رہا تھا۔

انقلاب کے پہلے دو ہفتوں میں انبالہ اور جالندھر، ہریانہ اور نصیرآباد سے انقلابیوں کے ساتھ مزید سپاہی پہنچ رہے تھے۔ بنگال کی 139000 فوج میں سے صرف 7796 انگریزوں کے پاس بچے تھے۔ باقی بغاوت کر چکے تھے۔ ان میں سے اچھی تعداد دہلی میں تھی یا راستے میں۔ شاہ مل جاٹ سے بغاوت کرتے ہوئے تین سے چار ہزار مسلح جاٹوں نے برٹش لائنوں پر باغ پت میں حملہ کر کے انگریزوں کی دہلی فیلڈ فورس کا رابطہ میرٹھ سے کاٹ دیا تھا۔

فری لانس جہادی جس میں وہابی مولوی بھی تھے، عسکریت پسند نقشبندی فقیر بھی اور مسلمان سویلین بھی، ان کا چار ہزار کا پہلا دستہ آیا تھا۔ جہادیوں نے اپنا کیمپ جامعہ مسجد کے صحن میں اور زینت المساجد میں لگایا۔ سپاہی اور جہادی اگرچہ ملکر لڑ رہے تھے لیکن آپس میں اعتماد کی کمی رہی۔ مجاہدین کی قیادت کے شعلہ بیان خطابات میں دہلی والوں نے زیادہ دھیان نہیں دیا اور بہت کم نے ان کے ساتھ شمولیت اختیار کی۔ زیادہ جہادی پنجاب سے تعلق رکھنے والے کپڑا بننے والے، تاجر اور دیہاڑی دار تھے۔ ان کے ہتھیار گنڈاسے اور کلہاڑی تھے، نیلے کپڑے اور سبز پگڑیاں ان کی پہچان تھیں۔ دہلی کے کلچر کے نازک توازن سے بے خبر تھے۔

انہیں نظرانداز کئے جانے کی شکایت تھے۔ ان میں سے کچھ ظفر کے پاس درخواست لے کر آئے کہ ”ہم کافروں کے خلاف جہاد کرنے بڑے ولولے سے آئے ہیں لیکن ہمارا خیرمقدم نہیں کیا گیا۔ کل ہم نے اپنے ہاتھوں سے اٹھارہ کافر جہنم واصل کئے ہیں۔ دوسری آرمی ہمارا ساتھ نہیں دیتی، وہ الگ تھلک کھڑے رہتے ہیں۔ اگر وہ ساتھ دیتے تو بڑی کامیابی حاصل کی جا سکتی تھی۔ ہمیں مدد بھی چاہیے، فنڈ بھی اور ہتھیار بھی تا کہ ہم کافروں کو ختم کر سکیں اور ان کے ارادے ناکام بنا سکیں“۔

جولائی کے آخر تک جہادی پارٹیاں آتی رہیں۔ دہلی میں ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ خوراک اور فاقہ زدگی کا رہا۔

ان گروپس کے آنے سے ہندوؤں کے رویے میں فرق آیا۔ مئی اور جون میں انگریز کے خلاف ردِعمل میں ہندو اور مسلمان میں فرق نہیں تھا۔ ہندو پنڈت بھی انگریز کے خلاف اتنے ہی شعلہ بیان تھے جتنے مسلمان مذہبی راہنما۔ پنڈت شاسترا سے احکامات سنایا کرتے تھے کہ ان کے لئے انگلش ملیچھ سے لڑنا کیوں ضروری ہے۔ پنڈت ہری چندرا اس معاملے میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے اپنے ماننے والوں کو بتایا تھا، ”نئی کوروک شاسترا لکھی جا رہی ہے، جیسا کہ کرو اور پانڈے کی جنگ تھی۔ سپاہیوں کے گھوڑوں کے قدم انگریز خون سے رنگے ہوں گے اور جیت ہمارا مقدر ہے“۔

فتحِ اسلام کے عنوان سے شائع ہونے والے پمفلٹ میں لکھا تھا، ”یہ دین اور دھرم کی جنگ ہے۔ گائے کی حرمت اور سور کی نجاست نہ ماننے والوں سے جنگ ہے۔ ہندوؤں کو اپنا دھرم بچانے کے لئے بادشاہ کا ساتھ دینا ہو گا۔ ہندو اور مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ہم اکٹھے ملکر انگریز کو ختم کریں گے۔ مسلمان بادشاہ ہمیشہ سے سب کی جان و مال کی حفاظت کرتے آئے ہیں۔ ہندو دل و جان سے مسلمان بادشاہوں کے وفادار رہے ہیں۔ ہندو کے لئے ان کا دھرم، مسلمان کے لئے اس کا دین۔ اور اس کی خاطر ایک دوسرے کا ساتھ“۔

جیسا کہ بعد میں سید احمد خان نے نوٹ کیا کہ برٹش فوج میں کام کرنے والے سپاہی اکٹھا رہ کر ایک دوسرے کے ساتھ اتنے گھلے ملے ہوئے تھے کہ ہندو سپاہی مسلمان اصطلاحات استعمال کرتے تھے۔ اس انقلاب کو ہندوؤں میں بھی جہاد کہا جاتا تھا اور برٹش کو کافر۔

جہادیوں کی آمد کے ساتھ یہ مزاج بدلنے لگا اور ساتھ ہی تناؤ بھی آ گیا۔ لیکن ان کی جرات اور بے جگری بے مثال تھی۔ اور ان جہادیوں میں سے کئی مشہور جہادی خواتین تھیں۔ سعید مبارک شاہ کے الفاظ میں۔

‘‘ان میں سے کئی جنونی دست بدست مقابلہ کرنے کو پسند کرتے تھے اور اسی وجہ سے بڑی تعداد میں مارے گئے۔ لیکن یہ پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ رام پور سے آنے والے دو خواتین اکثر باغیوں کی قیادت کرتے دیکھی گئیں۔ ننگی تلواروں کے ساتھ دور تک گھس جاتیں اور سپاہی اگر ہچکچاتے تو انہیں بے نقط سناتیں کہ عورتوں سے پیچھے رہ گئے ہو؟ رام پور کی خواتین میں سے ایک پکڑی گئی۔ خواتین اسلحہ لا کر دیتیں اور اگلے مورچوں میں لڑنے والوں میں بھی تھیں’’۔

لیکن حملوں میں بار بار ناکامی کیوں ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ جلد ظاہر ہونے لگی۔ یہ بہادری کی کمی نہیں تھی بلکہ جنگی حکمتِ عملی کا فقدان تھا اور کوآرڈینیشن نہ ہونا تھا۔ اگر سپاہیوں کی مسلسل آمد جاری نہ ہوتی تو یہ انقلاب دم توڑ چکا ہوتا۔

پاگل پن کی حد تک بہادری دکھاتے ہوئے سامنے سے حملہ کرنے والے برٹش کی دہلی فیلڈ فورس کے لئے تر نوالہ تھے۔ ان سپاہیوں کا مقابلہ اپنے سابق افسران سے تھا جو ان کی بہادری سے متاثر تھے لیکن حکمت عملی سے نہیں۔ یہ استاد اور شاگرد کی لڑائی تھی (سپاہیوں کو انگلش آفیسرز نے تربیت دی تھی)۔ جس میں سپاہی اپنی بڑی تعداد کے باوجود ناکام ہو رہے تھے۔

اس موقع پر جہادی سپاہیوں سے بھی زیادہ غیر موثر تھے۔ وہ اپنے گنڈاسے اور تلواریں استعمال کرنے قریب ہی نہیں پہنچ پاتے تھے۔ ٹائمز میگزین کے ولیم رسل نے مشرقی دہلی سے یہ ایکشن دیکھا۔

‘‘غازی اچھے لوگ تھے۔ لمبی داڑھیوں والے زیادہ عمر کے لوگ جو سبز پگڑیاں اور کمربند پہنے ہوتے تھے اور چاندی کی انگوٹھی جس میں قرآنی آیت کنندہ تھی۔ اپنا سر ڈھال کے پیچھے چھپا کر تلواریں لہراتے ‘‘دین، دین، دین’’ کے نعرے لگاتے ہوئے بے حال ہو جاتے اور پھر دیوانہ وار حملہ کرتے۔ ان کا ایک جری جوان ہماری طرف اسی حالت میں بڑھا۔ ایک نوجوان فوجی نے اس کی آنکھوں کے درمیان نشانہ لیا اور گولی مار کر گرا لیا۔ اس کے بعد اس کے چہرے میں سنگین اتار دی جس سے وہ بے چارہ وہیں ختم ہو گیا’’۔

سپاہیوں میں سے کئی لڑائی سے جان چھڑوانا شروع ہو گئے تھے۔ باغوں میں پڑے رہتے یا مزاروں میں پیرزادوں کو تنگ کرتے۔ 23 جون کو کمانڈر انچیف مرزا مغل کا آرڈر نظر آتا ہے۔

‘‘یہ جنگ مذہب کی جنگ ہے لیکن کئی لوگ جنگ میں نہیں جا رہے۔ کئی اپنے کوارٹروں میں چھپے رہتے ہیں کہ ان کی جان بچ جائے۔سب نے بادشاہ سے وعدہ لیا تھا۔ نمک حلالی کا تقاضا ہے کہ پلاٹون کافروں کو ختم کریں گی لیکن وہ ہمت نظر نہیں آ رہی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جب ہمارا مذہب خطرے میں ہے، پھر بھی ایسا کرنا؟؟ کل سے اگر کوئی

پلاٹون لڑنے نہ پہنچی تو اس کا مشاہرہ بند کر دیا جائے گا اور جو بہادری دکھائیں گے انہیں انعامات اور تمغے ملیں گے اور بادشاہ سلامت خود ان کا شکریہ ادا کریں گے''۔

انقلابیوں کے نقطہ نظر سے سب سے افسوسناک چیز یہ رہی کہ انہوں نے برٹش کی کمزوری ڈھونڈ لی تھی۔ 19 جون میں کئے گئے حملے میں سپاہی معمول سے ہٹ کر نئے طریقے سے حملہ آور ہوئے تھے۔ یہ تین اطراف سے کیا گیا حملہ تھا۔ برٹش فوج کو اس کا مقابلہ کرنے میں بہت دشواری ہوئی تھی۔ سورج طلوع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے عقب سے حملہ کیا گیا تھا، پھر دو اور جگہ سے۔ انگریزوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ جان روٹن کہتے ہیں،

''دشمن بڑی تعداد میں آیا۔ ہم سوچا کرتے تھے کہ وہ عقب سے کیوں حملہ آور نہیں ہوتے۔ اس روز وہ حملہ آور ہوئے تھے۔ ہم بہت مشکل صورتحال سے دوچار ہوئے تھے۔ بہت مشکل سے مقابلہ کیا تھا اور صرف رات کی ہو جانے والی تاریکی تھی جس نے ہمیں بچا لیا۔ اس کے بعد کیمپ میں ہر ایک کے دل میں خوف بیٹھ گیا۔ اگر دشمن ایسا کرتا رہا تو کیا ہو گا؟ اچھی چیز یہ رہی کہ ہمیں اپنی کمزوری کا پتا تھا، دشمن کو نہیں''۔

انقلابیوں کے پاس کسی بھی انیٹیلی جنس نیٹورک کے نہ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ انہیں پتا ہی نہیں لگ سکا کہ وہ فتح کے کتنے قریب تھے۔ انہوں نے اس طریقے کا حملہ بہت دیر بعد دوبارہ کیا۔ اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

نگ کا توازن

دلی کا محاصرہ کرنے والے برٹش فوجی اچھے حال میں نہیں تھے۔ اگرچہ ان کی خوراک کی سپلائی متاثر نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے علاوہ ان کے لئے صورتحال مخدوش تھی۔ روز کے حملوں اور توپ کے گولوں کے علاوہ ان کا ایک دشمن سورج تھا۔ دہلی کی گرمی میں سورج سے بچنے کے لئے خیموں کے سوا کوئی پناہ نہیں تھی۔ کئی لوگ سن سٹروک سے مارے گئے۔ پانی صرف جمنا نہر سے ملتا تھا اور یہ پانی ہے یا مٹر کی یخنی؟ اس میں فرق معلوم نہیں ہو پاتا تھا۔ سیوریج کا کوئی انتظام نہیں تھا۔

مرنے والوں کے سیاہ ہوتے اور بدبو دیتے جسم بڑھ رہے تھے۔ علی پور سے کیمپ تک موت ہر صورت میں موجود تھی۔

ایک اور مسئلہ مکھیوں کا تھا۔ خیموں میں، کھانے میں۔ روٹن لکھتے ہیں،

""کھانے کے اوپر مکھیوں کی تہہ ہوتی تھی۔ چائے کے کپ پر بھی مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔ اگر احتیاط نہ کریں تو یہ اوپر سے مکھیوں بھر جاتا تھا جو اس کے اوپر تیر رہی ہوتی تھیں۔کچھ مردہ اور کچھ قریب المرگ""۔

چارلس گرفتھ ایک نوجوان لیفٹیننٹ تھے، لکھتے ہیں۔ ""آپ کی آنکھ گولے یا بِگل کی آواز سے نہیں، مکھیوں کے منہ پر بیٹھنے سے کھلتی تھی۔ مرے ہوئے لوگوں کی لاشیں انہیں مرغوب تھیں۔ ہوا بدبودار تھی، گرمی شدید تھی۔ اور ہمارے کیمپ میں اس وجہ سے روز لوگ مر رہے تھے""۔

یہ مزید خراب اس وقت ہو گیا جب 27 جون کو مون سون کی تیز بارش نے آن لیا۔ برٹش آرمی کیمپ کیچڑ اور بدبودار دلدل بن گیا۔ بچھو اور سانپ بلوں سے نکل آئے۔ رات کی نیند بھی مشکل ہو گئی۔ اور پھر ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی۔ میڈیکل کی سہولیات مفقود تھیں۔ زخمی ہو جانے والے زندہ نہیں بچتے تھے۔

جولائی آیا اور برٹش اپنے کیمپ کو بہتر بناتے گئے۔ ہیضے سے مرنے والوں کی تعداد انقلابیوں کے ہاتھوں مرنے والوں سے زیادہ تھی۔ 5 جولائی کو برٹش آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل برنارڈ کا انتقال بھی ہیضے کے ہاتھوں ہوا۔ اس سے پہلے جنرل اینسن مئی میں بھی ہیضے سے فوت ہوئے تھے۔ نئے سربراہ جنرل تھامس ریڈ تھے جو دو ہفتوں میں ہی بیمار ہو کر میدان چھوڑ گئے اور قیادت 17 جولائی کو جنرل ولسن کے پاس آ گئی۔

اگلے روز ولسن نے لاہور میں جان لارنس کو خط لکھ کر معاملات کی سنجیدگی کا بتایا اور یہ کہ کسی بھی قیمت پر فوج دہلی بھیجی جائے اور جلد ایسا نہ کیا دہلی میں شکست ہوتی نظر آ رہی ہے۔ امداد بہت سی چاہیے، جلد چاہیے اور پنجاب سے کمک بھجوائی جائے۔ کم از کم ایک یورپی رجمنٹ، ایک سکھ رجمنٹ اور ایک پنجابی رجمنٹ۔ ورنہ انہیں جلد پسپا ہو کر کرنال کا رخ کرنا پڑے گا اور اگر ایسا ہو گیا تو نقصان ناقابلِ تلافی ہو گا۔ (یہ کانفیڈنشل خط ریکارڈ میں محفوظ ہے)۔

ولسن کی مایوسی کی وجہ کیم جولائی کو دہلی میں بریلی بریگیڈ کی آمد تھی۔ اس میں چھ سو آرٹلری، سات سو سوار اور 2300 سپاہی تھے۔ چودہ ہاتھی، تین سو گھوڑے، ایک ہزار بیل گاڑیاں، ٹینٹ، اسلحہ اور سپلائی، خزانہ اور ان کے پیچھے تین سے چار ہزار غازی۔

دو جولائی کو یہ دہلی میں کلکتہ گیٹ سے داخل ہوئے تھے۔ ان کا شاندار استقبال ہوا تھا۔ ملکہ زینت محل کے والد نواب قلی خان نے مٹھائی اور پھل تقسیم کئے تھے۔ انہوں نے ڈیرہ دہلی دروازے کے باہر جمایا کیونکہ شہر میں ان کے رہنے کی جگہ نہیں تھی۔

بریلی بریگیڈ میں ایک اور بہت اہم چیز لیڈرشپ تھی۔ بڑی بڑی مونچھوں اور لمبی قلموں والے آرٹلری کے صوبیدار بخت خان جنہوں نے انگریزوں کی طرف سے افغانوں کے خلاف جنگیں لڑی تھیں اور ان جنگوں کے ہیرو تھے۔ وہ موثر ملٹری قائد کی شہرت رکھتے تھے۔ بخت خان محاصرہ کرنے والی فوج کے کئی افسران کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ کرنل جارج بورشے نے ان سے فارسی پڑھی تھی۔ دوسرے لیڈر مولوی سرفراز علی تھے۔ انہیں امامِ مجاہدین کہا جاتا تھا۔ دہلی شہر اور دربار کو اچھی طرح جانتے تھے۔ دہلی میں دارالبقا میں جیومیٹری اور الجبرا پڑھاتے رہے تھے۔ بریلی بریگیڈ کے مجاہدین کے سربراہ تھے۔ یہ دو لوگ جہادیوں اور دہلی کی اشرافیہ کو اکٹھا کر سکتے تھے۔

آمد سے اگلے روز بخت خان اور مولوی سرفراز کو محل میں ریاستی پروٹوکول کے ساتھ بلایا گیا۔ یہاں پر انہیں فرزند اور صاحبِ عالم کے خطابات ملے اور مرزا مغل کو ہٹا کر بخت خان کو کمانڈر نچیف بنا دیا گیا۔ مرزا مغل کو انتظامی امور دیکھنے کا کام سونپا گیا۔

اگلے دن فوجی اصلاحات کے تھے۔ تنخواہوں کا بندوبست، لوٹ مار کرنے والوں سے بازپرس اور سزائیں، اسلحے کا سٹور سسٹم۔ تین انگریز جاسوس پکڑے گئے اور ان کو سزائے موت دی گئی۔ فوج کے تمام امور شہزادوں سے لے لئے گئے۔ فوجی پریڈ جو دہلی گیٹ سے اجمیری گیٹ تک ہوا کرتی تھی، شروع کی گئی۔

نئی ملٹری سٹریٹیجی آئی۔ فلینک سے حملے کرنے میں تین جولائی کو جزوی ناکامی ہوئی لیکن یہ نیا طریقہ تھا۔ روٹا سسٹم شروع ہوا تا کہ مختلف سپاہی مختلف وقتوں میں کام کریں اور برٹش کو سکون کا سانس نہ لینے دیا جائے۔ فوج کے تین حصے کئے گئے تا کہ باری باری انگریزوں کو الجھایا جائے۔ کوئی دن خالی نہ جائے۔

چند روز میں پانسہ بدل رہا تھا۔ برٹش آرمی تھک چکی تھی، امداد کا انتظار کر رہی تھی، جس کے بغیر مقابلے کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

شکل 17: بخت خان کا مجسمہ۔ جو دہلی کے لال قلعہ میوزیم میں کھینچی گئی۔

عید الاضحیٰ اور مذہبی صف بندی

جولائی کا مہینہ ختم ہو رہا تھا اور یکم اگست کو عیدالاضحیٰ تھی۔

بخت خان کی آمد اور نئی ملٹری حکمتِ عملی کے بعد دہلی میں امیدیں بڑھ گئی تھیں۔ 9 جولائی کا حملہ بے حد کامیاب رہا، لیکن انٹیلی جنس نہ ہونے کی وجہ سے دہلی میں خبر نہیں ہوئی تھی کہ نئی حکمتِ عملی کتنی کامیاب جا رہی ہے۔ بخت خان ایک پروفیشنل فوجی تھے۔ ان کی خوبیوں میں معاملہ فہمی نہیں تھی۔ اور جلد ہی اختلافات شروع ہو گئے۔ نیمچ بریگیڈ کے جنرل غوث خان اور سدھاری سنگھ اب ان کے حریف تھے۔ جولائی کے آخر میں چہ میگوئیاں زور پکڑنے لگیں۔ جب 29 جولائی کا حملہ بارش کی وجہ سے ملتوی ہو گیا تو ظفر نے کہا، ''جو آپ لوگ ساتھ لائے تھی، وہ خرچ ہو چکا ہے۔ ہمارا خزانہ خالی ہو چکا ہے۔ فتح کی طرف کچھ بھی پیشرفت نہیں ہوئی۔ کئی سپاہی مایوس ہو کر واپس جانا شروع ہو گئے ہیں''۔

اور اس وقت کسی کو حیرت نہیں ہوئی جب بخت خان کو کمانڈر انچیف کے عہدے سے جولائی کے آخر میں برطرف کر دیا گیا اور کمانڈ دس رکنی کمیٹی کے سپرد کر دی گئی۔

جولائی کے آخر میں آنے والے ایک اور مسئلہ عیدالاضحیٰ کا تھا۔ اس میں ٹونک کے کچھ غازیوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ بکرا یا دنبہ ذبح نہیں کریں گے بلکہ صرف گائے کی قربانی کریں گے، سرِعام کریں گے اور یہ جامع مسجد کے آگے ہو گا۔ اور جس ہندو نے اسے روکنے کی کوشش کی، اس کا بھی سر اتار دیا جائے گا۔ ہم دین کی خاطر لڑنے آئے ہیں اور شہادت خواہ ہندو کے ہاتھ سے آئے یا فرنگی کے، سب برابر ہے۔

اس اعلان کے بعد کچھ ہندو سپاہیوں نے پانچ مسلمان قصابوں کے گلے کاٹ دئے کہ انہوں نے گائے کو مارا ہے۔ شہر میں ہندو مسلم فسادات کا بحران صاف نظر آ رہا تھا کیونکہ نصف آبادی ہندو تھی اور نصف مسلمان۔ بہادر شاہ ظفر ہمیشہ اس

میں توازن رکھتے آئے تھے۔ انہیں خطرے کا اندازہ تھا۔ انہوں نے اس پر فوری ایکشن لیا اور اعلان کیا کہ جس نے گائے کو ذبح کیا یا گائے کا گوشت کھایا۔ یا کسی کو ذبح کرنے کو کہا تو اسے توپ کے آگے رکھ کر اڑا دیا جائے گا۔ اس کے بعد شہر کی انتظامیہ کو حکم جاری کیا کہ تمام گائے رکھنے والے مسلمانوں کی فہرست بنائی جائے۔ یہ پانچ سو سے ایک ہزار کے درمیان تھیں۔ ان سے عہد لیا گیا کہ وہ انہیں ذبح نہیں کریں گے۔ مفتی اعظم صدرالدین کو مجاہدین سے مذاکرات کے لئے بھیجا گیا۔ صدرالدین نہ صرف دینی عالم تھے بلکہ مجاہدین میں بہت عزت رکھتے تھے۔ سرسید کے مطابق داناؤں کے دانا تھے۔ یہ کیسے کیا گیا؟ یہ تو ریکارڈ میں نہیں لیکن مولوی سرفراز اور دوسرے مجاہدین نے عید پر گائے کھانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

بہادر شاہ ظفر کے بروقت لئے گئے اقدامات سے یکم اگست خیروعافیت سے گزر گیا۔ برٹش، جنہیں اس سب کی خبر جاسوسوں کے ذریعے تھی، بڑے ہنگاموں کی توقع اور امید کر رہے تھے لیکن یہ نہ ہو سکا۔ ہاروی گریٹ ہیڈ نے اس پر بڑبڑاتے ہوئے اپنی بیوی کو خط میں لکھا، ”کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ مسلمان اپنے دین کے لئے لڑ رہے ہیں اور عید پر ایک مسلمان بادشاہ کے ہوتے ہوئے، ان میں سے کسی کو گائے ذبح کرنے کی اجازت بھی نہ تھی“۔

عید پر ہونے والی ٹینشن ظفر کے لئے ایک ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ اڑھائی ماہ سے شہر میں لاقانونیت تھی لیکن اب شہر کا صدیوں پرانا امن بھی خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ ظفر ڈیپریشن میں جا چکے تھے اور سوچیں بے ربط ہو رہی تھیں۔ ان کی وفاداری دہلی کے ساتھ اور مغلیہ خاندان کے ساتھ تھیں اور یہ لگ رہا تھا کہ نہ دہلی بچے گا اور نہ ہی ان کا خاندان۔ یہ وہ وقت تھا جب ہمیں ان کی سوچ بے ربط نظر آتی ہے۔ مثلاً، انہوں نے اپنے سسر کو اودھ کا نواب بنا دیا۔ اودھ سو سال سے مغلوں کے پاس نہیں تھا۔ ناراض سپاہی جنرلوں کو دکن اور گجرات کے صوبے دار کی پوزیشن دے دی۔ یہ علاقے مغلوں کے ہاتھ سے نکلے اس سے بھی زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔

شاعری میں بھی ان کے موڈ کی طرح کبھی بہت مایوسی اور کبھی غیرحقیقی امید نظر آنے لگی تھی۔ سات اگست کو انہوں نے شعر لکھا کہ لندن جلد ہی ہمارے پاس ہو گا۔

بہادر شاہ ظفر کی ذہنی حالت کا اندازہ ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے جھاجر کے نواب کو لکھا،

”موجودہ ناخوشگوار حالات میں ہم خود کو امورِ حکومت اور ملک چلانے کا اہل نہیں سمجھتے۔ ہم بوڑھے ہو چکے ہیں، اس ضعف میں اب وہی کرنا چاہتے ہیں جو خدا کو راضی کر سکے اور خلقِ خدا کو۔ ہم باقی وقت یادِ الٰہی میں گزارنا چاہتے ہیں“۔

اس خط میں وہ اپنے بہت ہی غیرعملی پلان کا ذکر کرتے ہیں کہ تیمور کے گھرانے کی تمام جائیداد مہروالی کے خواجہ قطب کے مزار کے لئے وقف کر دی جائے اور شاہی گھرانے کے افراد مکہ اور مدینہ کی مقدس زمین کی طرف چلے جائیں۔ نواب آف جھاجر کو حکم دیتے ہیں کہ جب وہ چلے جائیں گے تو دہلی کو نواب آ کر سنبھال لیں۔ اس کے لئے چار پانچ سو اونٹ گاڑیاں اور پانچ چھ سو اونٹ لے کر آئیں کیونکہ دہلی میں اضافی سواریاں نہیں۔ اس میں شاہی خاندان ہجرت کر جائے گا۔

نواب بہادر شاہ کے دوست تھے لیکن اس جنگ میں غیرجانبدار تھے۔ انہیں نے یہ پیشکش مسترد کر دی۔

بادشاہ نے برٹش سے بھی معاملہ کرنے کے لئے مذاکرات کا مراسلہ بھجوایا۔ اگرچہ جنرل ولسن اور لارنس نے برطانوی حکومت کو مشورہ دیا کہ بات چیت کر لینے میں حرج نہیں۔ گورنر جنرل کیننگ نے منع کر دیا کہ کوئی مذاکرات نہیں

ہوں گے۔ ظفر کے ذہن میں بھی یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ جب بغاوت کچل دی جائے گی تو وہ واپس پرانی پوزیشن پر جا سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ 1857 کی جنگ کا بڑا پہلو یہ تھا کہ یہ مذہبی جنگ تھی۔ لیکن یہ ایک عجیب صف بندی تھی۔ برٹش افواج میں زیادہ تر لوگ برٹش نہیں، ہندوستانی تھے۔ دوسری طرف ایک مسلمان بادشاہ کرسچن آرمی سے لڑ رہے تھے، لیکن جس نے یہ شروع کیا تھا، وہ زیادہ تر ہندو تھے جو خود اپنی مرضی سے بادشاہ کے پاس آئے تھے اور کہا تھا کہ انہیں بادشاہ کی سرپرستی اور ان سے برکت چاہیے۔ اور اس سے عجیب یہ کہ مغل فوجوں کی یکجہتی میں رخنہ آنے کی وجہ مسلمان جہادیوں کا گروپ تھا جو اب اس فوج کا نصف حصہ تھے اور دوسری طرف برٹش اس انقلابی فورس سے مقابلہ کرنے کے قابل اس وقت ہوئے تھے جب نئی آرمی آئی تھی اور اس میں سب سے بڑی تعداد میں آنے والے پٹھان اور پنجابی مسلمان تھے۔

برٹش افواج نے جب دہلی پر حملہ کیا تھا تو اس میں 80 فیصد مقامی لوگ تھے۔ ہندو سپاہیوں کی اودھ میں برٹش کے خلاف بغاوت سے شروع ہونے والی یہ جنگ جب ختم ہوئی تو باغیوں میں نصف سپاہی نہیں بلکہ سویلین جہادی تھے جو موجودہ خیبر پختون خواہ اور پنجاب سے آنے والی مسلمان اور سکھ افواج کا مقابلہ کر رہے تھے۔

اور برٹش آرمی کے برٹش بھی زیادہ تر ملی جلی نسل سے تھے۔ جان رابرٹس صوم و صلوۃ کے پابند مسلمان تھے اور ان کی شادی شہزادی بیگم سے ہوئی تھی۔ جان فریڈ اردو زبان کے شاعر تھے جو "جان" کا تخلص استعمال کرتے تھے اور انگریزی پڑھنے سے قاصر تھے۔ اور خود ان کے بھائی دوسری طرف انقلابی فوج کی طرف سے لڑ رہے تھے۔

اس مذہبی جنگ کی مذہبی صف بندی پہچاننا آسان نہیں تھا۔
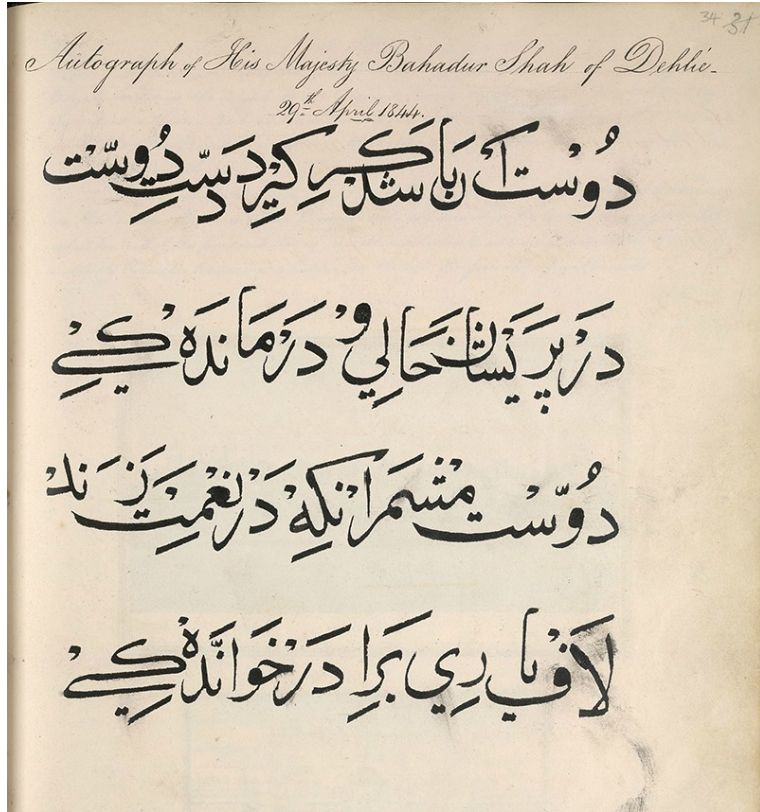
شکل 18: تصویر اس آٹوگراف کی جو میٹکاف کو بہادر شاہ ظفر نے اپنے ہاتھوں سے نظم کی صورت میں 1844 میں لکھ کر دیا تھا۔

خون کا بدلہ

اگست کے آغاز تک ملٹری توازن واپس برٹش کے پاس جا چکا تھا۔ اگرچہ ان کی تعداد شہر کی فوج سے بہت کم تھی لیکن شہر سے آنے والے حملوں کی تعداد اور شدت میں کمی آ گئی تھی۔ انقلابی سپاہی اور لیڈرشپ میں سے کئی دہلی چھوڑ رہے تھے۔ اس بار گریٹ ہیڈ نے اپنی بیوی کو خط میں لکھا، ''ہمارے دفاع کی چٹان سے ٹکرانے والی لہروں میں ویسی قوت نہیں رہی''۔

برطانوی کیمپ کا موڈ بدل گیا تھا۔ اب انتقام کی بات ہو رہی تھی۔ دہلی والوں کا قتلِ عام کھلم کھلا اور پرجوش طریقے سے ڈسکس کیا جاتا تھا اور یہ بھی کہ شہر کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ برٹش پریس میں کانپور میں بی بی گڑھ میں 73 خواتین اور 124 بچوں کے برٹش ہونے کے جرم میں کئے گئے قتل کو نمایاں جگہ ملی تھی۔ برٹش طیش میں تھے۔ دہلی سے جان بچا کر فرار ہو جانے والے جارج ویگنٹریبر نے لکھا۔ ''دلی کی آلودہ دیواروں کو مسمار کئے جانا ضروری ہے تاکہ ان کے آسیب کو ختم کیا جا سکے اور ان کے کالے کرتوتوں کی سیاہی ختم کی جا سکے۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ انصاف ہو گا۔ خون کا بدلہ خون ہے۔ دہلی کے بادشاہ کے تخت پر برٹش افسر بیٹھے گا۔ بادشاہ کے گلے میں رسی ہو گی اور اسے انصاف کی خاطر قربان کر دیا جائے گا۔ اور اس کے بعد ۔۔ دہلی میں خاموشی کا راج ہو گا۔ موت کی خاموشی۔ برٹش انصاف کے تباہ کن طوفان میں ہر ہندوستانی بہہ جائے گا''۔

پانچ اگست کو یہ انتقام ایک قدم قریب آ گیا۔ برٹش دہلی فیلڈ فورس تک خبر پہنچی کہ کمک کے لئے بڑی فوج کا پہلا دستہ پنجاب سے روانہ ہو گیا ہے۔ اس کے لئے لارنس نے ایک بڑا جوا کھیلا تھا۔ پنجاب میں موجود تقریباً تمام یورپی فوجی اس

پہلے قافلے کا حصہ تھے۔ مقامی رضاکاروں کی بھی تعداد تھی۔ یہ ایک میل لمبا قافلہ تھا جس میں بھاری توپخانہ بھی شامل تھا۔ یہ فیروزپور سے نکل کر انبالہ تک پہنچ چکا تھا۔ جی ٹی روڈ سے چند روز کی مسافت پر تھا۔ لارنس نے یہ جوا اس امید پر کھیلا تھا کہ وسطی ہندوستان میں لڑائی کے دوران مغربی ہندوستان میں لاہور سے پشاور تک کا علاقہ پرسکون رہے گا۔

اور انتقام پسند برٹش کے لئے ایک اور بہترین خبر تھی۔ ایک ہزار برطانوی، 600 پنجابی مسلمان سواروں (جن میں اکثریت ملتان سے تھی)، 1600 سکھوں اور توپخانے کی قیادت پشاور سے آنے والے برٹش فورس کے سفاک ترین افسر جان نکلسن کر رہے تھے۔

تریموں گھاٹ پر بغاوت کرنے والوں کے پورے دستے کا صفایا جس طریقے سے نکلسن نے کیا تھا، اس کا چرچا دور تک گیا تھا۔ یہ پورا دستہ سیالکوٹ سے دہلی کی طرف جا رہا تھا کہ نکلسن نے دریائے راوی کے کنارے گھات لگائی تھی۔ باغی سپاہیوں کے پیچھے دریا تھا اور آگے نکلسن کا دستہ۔ انہوں نے ایک بھی سپاہی کو جیتا نہیں چھوڑا تھا۔ مون سون میں بپھرے راوی میں چھلانگ لگانے کا مطلب موت تھا۔ کچھ کے لئے یہی واحد طریقہ بچا تھا۔ نکلسن قیدی بنانے کے قائل نہ تھے۔ اس روز بھی بہت کم قیدی بنائے تھے۔ اور یہ قیدی پکڑے جانے کے ساتھ ہی گولی کا نشانہ بن گئے تھے۔ نکلسن اب دہلی کی طرف آنے والے پہلے بڑے دستے کی قیادت کر رہے تھے۔

نکلسن ایک سائیکوپاتھ تھے، اذیت پسند اور ہندوستانیوں سے نفرت رکھنے والے۔ گورنر جنرل کیننگ کے مطابق ”نکلسن انتقام کا دیوتا ہے، وہ دشمن کے دل میں دہشت ہے“۔ لیفٹیننٹ اومانی نے ان کی اذیت پسندی کو دیکھا تھا اور شاک میں رہ گئے تھے۔ اپنی ڈائری میں انہوں نے لکھا کہ ایک باورچی لڑکے کو انہوں نے اس لئے مارا تھا کہ وہ مارچ کرنے والوں کی لائن کے آگے آ گیا تھا۔ جب اس لڑکے نے مار پڑنے پر شکوہ کیا تو دوسری بار پڑنے والی مار کے بعد جانبر نہ ہو سکا۔ اپنی فوج کو بھی قیدیوں کو تشدد کے بارے میں کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ اومانی کی ڈائری میں اس کے کئی ہولناک واقعات درج ہیں۔

چودہ اگست 1857 کو ولسن دہلی کے باہر پہنچ گئے تھے۔

نکلسن کی دوسری خاصیتوں میں انتھک محنت اور تفصیل میں جا کر ہر چیز کو دیکھنا تھا۔ برٹش جنرل ولسن کو نکلسن اور نکلسن کو جنرل ولسن بالکل پسند نہیں آئے۔

دہلی سے برٹش فورس پر حملے کم ہو چکے تھے۔ برٹش کو پسند کرنے والے پنجاب کے راجاؤں کی طرف سے برٹش فوج کو تحائف اور کھانے پینے کا سامان ملنا شروع ہو گیا تھا۔ جھینڈ کے راجہ نے انگریزوں کے لئے خوراک اور روزمرہ کی اشیاء کی سپلائی بیس بنا دی تھی۔ انبالہ سے چاکلیٹ، ٹوتھ پاوڈر اور دوسرا سامان۔ جہانگیر اور کاوس جی سستی بیئر پہنچانے لگے تھے۔

ہیضہ ابھی بھی روز کی جانیں لے رہا تھا۔ مردہ جانوروں اور انسانوں کی لاشوں سے اٹھنے والا تعفن برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا لیکن برٹش خندقوں میں حوصلے اب بلند تھے۔ دہلی کی طرف سے ان کے لئے اچھی خبریں آ رہی تھیں۔ کئی کی نگاہیں اب دہلی کے مالِ غنیمت پر لگی تھیں۔ کہیں سے ایک دو ہیرے اچک لیں گے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ دہلی ہندستان کا خوشحال ترین شہر تھا۔ فوجی اس کی دولت سے فیض یاب ہونے کے خواہشمند تھے۔ جب کہ کئی برٹش، جن کے خاندان کے افراد قتلِ عام میں مارے گئے تھے، انتقام کی آگ بجھانا چاہتے تھے۔

شکل 19: نکلسن کا مجسمہ- جو دہلی میں نصب رہا۔ انڈیا کی آزادی کے بعد اس کو اتار کر برطانیہ بھجوا دیا گیا۔

مئی سے جاری اس جنگ کے فیصلہ کن مراحل قریب آ رہے تھے۔

گیم پلٹ گئی

انگریزوں کی دماغ گھما دینے والی سفاکی کی خبریں دہلی پہنچ رہی تھیں۔ کانپور میں جنرل نیل نے جو کچھ کیا تھا، وہ کسی کا بھی دل لرزا سکتا تھا۔ جس جگہ پر قبضہ کیا، وہاں قتلِ عام کیا۔ راستے کے ہر گاؤں کو نذرِ آتش کر دیا۔ خواتین اور بچوں کو گھروں میں بند کر کے آگ لگا دی۔ سکھوں کو اجازت تھی کہ پکڑے جانے والوں کو جیسے مرضی اذیت دیں۔ خون آلود زمین چاٹنے پر مجبور کیا گیا۔ مسلمانوں کو سور اور ہندوؤں کو گائے کا گوشت کھلایا گیا اور پھر لٹکا دیا گیا اور اسی پر بس نہیں کیا۔ ہندوؤں کو دفن کیا اور مسلمانوں کو جلا دیا گیا۔

ہر جگہ پر انگریزوں نے خود کو قائل کر لیا تھا کہ چونکہ انگریزوں کا قتلِ عام ہوا ہے، اس لئے انقلابیوں کے ساتھ انسانوں والا سلوک روا رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اپنے مخالفین کو انسان سمجھنا بند کر دیا گیا تھا۔ کیپٹن والڈ کی ڈائری سے، ”میرے لئے یہ کلوٹے سانپ اور بچھوؤں جیسے ہیں۔ ان کا واحد علاج ان کا سر کچل دینا ہے“۔

دہلی کے اندر خوراک، اسلحہ اور پیسے ختم ہو رہے تھے۔ فاقہ زدہ سپاہیوں نے دہلی چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ گریٹ ہیڈ کہتے ہیں، ”مجھے شہزادوں کے خط ملنے لگے ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ سے برٹش کو پسند کرتے رہے ہیں اور ہمارے ساتھ ہیں اور وہ یہ پوچھتے ہیں کہ وہ ہمارے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ اس کا جواب میں نہیں بتاؤں گا۔ یہ انہوں نے خود کر کے دکھانا ہے“۔

دہلی کے انقلابیوں کا ایک بڑا مسئلہ کمیونی کیشن کا تھا۔ نہ وہ مخالف فوج کے بارے میں انٹیلی جنس حاصل کر پائے تھے۔ نہ ہی وہ لکھنؤ اور کانپور کے فوجیوں سے کوآرڈینیشن کر سکے تھے۔ نہ راجپوتانہ یا وسطی ہندوستان کے آزاد حکمرانوں کو اپنا

ساتھ دینے پر آمادہ کر سکے تھے۔ اگر انہیں صرف یہ معلوم ہو جاتا کہ عقب سے ان کے کئے گئے حملے کتنے کارگر رہے تھے تو دو دنوں میں برٹش فوج کا صفایا کر سکتے تھے۔ اور جتنی کمزوری ان کی سٹریٹیجی اور ملٹری حکمتِ عملی کی تھی، اتنی ہی انتظامی اور مالیاتی حکمتِ عملی کی بھی۔ بدنظمی پیدا کرنا آسان کام ہے، اس کو کنٹرول کرنا بہت مشکل۔ اپنے زیرِانتظام علاقوں میں گورننس قائم نہ کر سکے۔ ٹیکس اکٹھا نہ کر سکے اور سب سے بڑھ کر، خوراک کی سپلائی چین برقرار نہ رکھ سکے۔

جون سے جولائی آیا، جولائی سے اگست۔ شہر بھوکا اور پیاسا ہوتا گیا۔ جون میں برٹش نے جمنا نہر کو کاٹ دیا تھا۔ سقوں کے لائے گئے پانی پر انحصار رہ گیا تھا۔ آٹے یا دالوں کا شہر میں جون سے کال پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ 28 جولائی کو قادر بخش اور کشن دیال، جو میرٹھ کے سپاہیوں کے صوبے دار تھے، دربار میں شکایت لے کر آئے کہ ان کے فوجی فاقہ کشی کا شکار ہیں۔ اپنا سب کچھ میرٹھ چھوڑ آئے تھے اور اب سخت مشکل میں ہیں۔ نہ ان کے پاس پیسے ہیں اور نہ کوئی ادھار دیتا ہے۔ کوتوال میں دکانداروں نے شکایت کی تھی کہ انہیں پچھلا ادھار واپس نہیں ملا، وہ قرض نہیں دے سکتے۔ اور مغل یہ پیسے فوج کو دینے سے قاصر تھے۔ 14 اگست کو مدھیہ پردیش سے آنے والی نیمچ بریگیڈ نے دھمکی دی کہ اگر کھانے کو نہ ملا تو وہ واپس چلے جائیں گے۔ دو صوبے دار سدھاری سنگھ اور ہیرا سنگھ شکایت لے کر بہادر شاہ ظفر کے پاس آئے۔ اگست کے پہلے ہفتے میں ساڑھے سات سو سپاہی اور چھ سو جہادی واپس روانہ ہو گئے تھے۔

سول انتظامیہ نے پیسے جمع کرنے کی کوشش کی۔ پہلے ادھار لے کر، پھر شاہی خزانچی کی پوزیشن نیلام کر کے، پھر ساہوکاروں، بنیوں، بینکاروں کو دھمکا کر۔ اسلحہ کم ہونے کا مسئلہ ایک اور بڑی انتظامی ناکامی تھی۔ دہلی میں اسلحہ بھاری مقدار میں تھا۔ انقلاب کے پہلے دس دنوں میں کسی نے اسلحہ ڈپو پر گارڈ تعینات نہیں کئے تھے۔ لوگ ہتھیار اٹھا کر لے گئے تھے۔ سب سے زیادہ یہ کام خانہ بدوش گوجروں اور میواتیوں نے کیا تھا اور یہ اس کے بعد دہلی کے لئے بڑا خطرہ بنے رہے۔

ظفر کے ڈیپریشن میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک جاسوسی رقعے میں لکھا تھا، ''کل دو سو تلنگے عسکری یونیفارم میں آئے کہ وہ واپس جا رہے ہیں۔ ان کی بیویاں اور گھر والے انتظار کر رہے ہوں گے اور پریشان ہوں گے۔ اور ہمارے پاس اب کھانے کو بھی کچھ نہیں۔ ہم رخصت چاہتے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ وہ اپنے ہتھیار جمع کروا جائیں۔ انہیں پرواہ نہیں کہ کون رہتا ہے اور کون جاتا ہے۔ نہ میں نے کسی کو آنے کا کہا تھا اور نہ جانے سے روکوں گا۔ جو رہنا چاہتا ہے، رہے۔ جو جانا چاہتا ہے، جائے۔ مجھے اعتراض نہیں''۔

بنیے بے روزگار لوگوں سے قرض واپس وصول کرنے کے لئے تشدد کر رہے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے پرانی دشمنیاں اتارنے۔ کوتوال کا شہر پر کنٹرول نہیں رہا تھا۔ دہلی اردو اخبار، جس نے انقلابیوں کی آمد کو غیبی معجزہ کہا تھا اور انگریز کی روانگی کو برٹش تکبر کا نتیجہ قرار دینے پر مئی میں کالم لکھا تھا، اب موڈ برعکس تھا۔ ''جو ہو رہا ہے، یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔ ہم نے خود کو خدا سمجھ لیا اور اس کے احکامات سے روگردانی کی۔ یہ عذاب اس کی نشانی ہے''۔ یہ 23 اگست کے اخبار میں محمد باقر کا لکھا گیا کالم تھا۔

لیکن برٹش کے خلاف فتح کی بچی کھچی امید میں جو سب سے بڑی رکاوٹ تھی وہ مختلف دھڑوں کے آپس کے اختلافات تھے جو بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ نیمچ بریگیڈ اور بخت خان کے درمیان تلخ جذبات تھے۔ نیمچ نے بخت خان پر انگریزوں کا حامی ہونے کا الزام لگایا تھا جو غلط تھا۔ نیمچ کو اس پر قائل کرنے والے ہریانہ کے برٹش جاسوس غوری شنکر سکل تھے

جنہوں نے ایک (جھوٹا) گواہ پیش کیا تھا جس نے بخت خان کو انگریزوں کو پیغامات بھیجتے دیکھا تھا۔ نمیچ بریگیڈ اور بریلی بریگیڈ کے درمیان یہ تلخ کلامی ظفر کے سامنے ہوئی تھی۔

بخت خان نے حملے کا ایک نیا اور اچھوتا پلان بنایا۔ اس میں یہ دکھائے جانا تھا کہ اجمیری گیٹ سے فوج کا بڑا حصہ دہلی چھوڑ کر جا رہا ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ جے پور کے رخ جائے، یہ فوج نجف گڑھ کے قریب نہر کا پل پار کرے اور چھپ کر برٹش پر واپس عقب سے حملہ آور ہو۔ یہ اس قسم کی سوچ تھی جس کی کمی رہی تھی اور دو ماہ پہلے اگر یہ کیا جاتا تو بہت موثر ثابت ہوتا۔ ظفر نے اس کی حمایت کی اور جاتی ہوئی فوج کو کہا، ''جاؤ، خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔ آج اپنی وفاداری دکھا دو۔ انگریزوں کو تباہ کر کے فتح یاب ہو کر واپس آؤ''۔

یہ چوبیس اگست کا دن تھا۔ بخت خان نے یہ سب سے بڑا حملہ کیا۔ نو ہزار آدمی اور تیرہ فیلڈ گن۔ یہ نجف گڑھ کی طرف بڑھیں۔ برسات کی موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ جب پل تک پہنچے تو پتا لگا کہ جنرل ولسن اس کو دفاعی حکمت عملی کے تحت پہلے ہی گرا چکے ہیں۔ بخت خان اس کے لئے تیار تھے۔ اس پل کی مرمت کی لیکن تربیت یافتہ افراد نہ ہونے کی وجہ سے اس میں چوبیس گھنٹے لگ گئے۔ اس دوران موسلادھار بارش میں ان کی فورس کھلے آسمان تلے تھی اور اس دوران کچھ نہیں کھایا پیا تھا۔

پچیس تاریخ کو انقلابی فورس نے یہ پل پار کیا اور آگے بڑھنا بہت مشکل مرحلہ رہا۔ تھکے ہوئے فوجی جھیل کے کنارے پہنچے۔ آرام کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ساتھ لائی گئے توپیں کیچڑ میں دھنس جاتی تھیں۔ ان کو آگے لے جانا مشکل تھا۔ سپاہیوں کو گھٹنے گھٹنے پانی والی زمین میں چلنا پڑتا تھا۔ بریلی بریگیڈ سے آگے سدھاری سنگھ اور ہیرا سنگھ کی قیادت میں نمیچ بریگیڈ تھی۔ اس سے کچھ پیچھے نصیر آباد کی چھوٹی فورس۔ اس سے دو روز پہلے ہی نمیچ قیادت نے بخت خان کو قیادت سے ہٹانے کی کوشش کی تھی اور یہ سب کامیابی کے لئے اچھا کمبی نیشن نہیں تھا۔

نمیچ بریگیڈ کا مقابلہ نکلسن کے فوجی دستے سے ہوا۔ بخت خان تک خبر پہنچی۔ تین روز پہلے نمیچ جنرلوں نے ان پر غداری کا الزام لگایا تھا۔ بخت کو اس بریگیڈ کو بچانے میں دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی بریگیڈ کی پیش قدمی روک دی۔ اگر نصیر آباد کا دستہ مدد نہ کرتا تو نمیچ بریگیڈ کا کوئی بھی شخص نہ بچتا۔ لیکن یہ ایک فیصلہ کن پوائنٹ ثابت ہوا۔ اتنی بڑی شکست انقلابی فوج کو پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔

بخت خان جب واپس پہنچے تو اپنی عزت گنوا چکے تھے۔ نمیچ کے سپاہیوں کو چھوڑ جانے پر انہیں شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ بہادر شاہ ظفر نے جنرل بخت خان کو پیغام بھجوایا کہ انہوں نے یہ حرکت کر کے نمک حرامی کی ہے۔

جب چار ستمبر کو مغربی ہندوستان سے آنے والی آٹھ میل لمبی فوج کی کمک برٹش کیمپ میں داخل ہوئی تو گیم پلٹ چکی تھی۔ دونوں فریقین میں کسی کو شک نہیں رہا تھا کہ برٹش کی طرف سے شہر پر پوری طرح براہِ راست حملہ قریب تھا۔

دہلی پر حملہ

چار ستمبر کو آٹھ میل لمبی ایک فوج کی کمک برٹش کیمپ میں داخل ہوئی۔ 60 ہاؤٹزر، اسلحے سے لدی 653 بیل گاڑیاں، گولے، اور بارود کے کنستر ۔۔۔ یہ پنجاب کی آرڈیننس فیکٹریوں میں تیار ہوا تھا جو اپنا کام پوری رفتار سے کر رہی تھیں۔ چھ توپیں اتنی بڑی تھیں کہ ہاتھیوں کے ٹیم انہیں کھینچ رہی تھی۔ چار سو یورپی سپاہی، بڑی تعداد میں سکھ سوار اور دوسرے۔ چارلس گرفتھ نے لکھا ہے کہ ”ان میں سب سے خونخوار بلوچ بٹالین لگ رہی تھی“۔

اگلے روز دہلی شہر کے دیواریں توڑنے کا پلان ایکشن میں آ گیا۔ اس کے لئے توپوں کی تنصیب کی تعمیرات ہونے لگیں۔ قلعے کی فصیل سے یہ دہلی والوں کو یہ تیاریاں نظر آ رہی تھیں۔ برٹش فوج کی تعمیرات کرنے والوں کو نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ مرنے والی برٹش فوج میں میں مقامی سپاہی بڑی تعداد میں تھے۔ فریڈ رابرٹس کے مطابق، ”ایسی بے وقوفانہ حد تک بہادری ہندوستانی ہی دکھا سکتے تھے۔ ہندوستانی قلیوں پر گولیاں برستی تھیں۔ ان کا کوئی بندہ گر جاتا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لئے رک کر افسوس سے سر ہلاتے تھے۔ کوئی اپنے دوست کے لئے آنسو بہا دیتا اور پھر لاش قطار میں رکھ کر کام میں جُٹ جاتے۔ اتنی بے خوفی اور دلیری کے بغیر یہ نہ ہو پاتا“۔

دہلی کے سپاہیوں میں ایک اور بغاوت چل رہی تھی۔ زینت محل کو ملکہ عالیہ کے عہدے سے ہٹا کر تاج بیگم کو ملکہ بنانے کی بات ہو رہی تھی کیونکہ زینت محل پر انگریزوں سے سازباز کا (درست) الزام تھا۔ شہزادوں مرزا ابوبکر اور مرزا خضر سلطان پر فنڈ خردبرد کرنے کا (غلط) الزام لگایا جا رہا تھا کہ انہوں نے شہر سے لاکھوں روپے اکٹھے کر لئے ہیں اور سپاہیوں کو ایک دھیلا نہیں دیا۔ بہادر شاہ ظفر نے محل کے چاندی کے برتن سپاہیوں کے حوالے کر دئے کہ انہیں بیچ کر ملنے

والے پیسے خود رکھ لیں۔

لیکن جب برٹش توپوں نے آٹھ ستمبر کو گولے اگلنا شروع کئے اور شہر کی فصیلوں کو نشانہ بنانے لگیں تو پہلی بار تمام انقلابی سب کچھ بھول کر اکٹھے ہو گئے۔ اس کا بڑا کریڈٹ مرزا مغل کو جاتا تھا جنہوں نے شہر کے دفاع کے لئے سب کو اکٹھا کرنے کے لئے کام کیا تھا۔

شہر کی شمالی دیواریں توپخانے کی زد میں تھیں۔ بارہ ستمبر کو 60 توپیں ایک کے بعد دوسرا گولہ برسا رہی تھیں۔ یہ چوبیس گھنٹے جاری تھا۔ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں کہ ''خدا جانے کتنی توپیں تھیں۔ دن رات دہلی لرز رہا تھا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ جہنم کا سماں تھا''۔

جس چیز کا برٹش کو علم نہیں تھا، وہ یہ کہ دوسری طرف شہر کے اندر مرزا مغل نے رکاوٹوں اور دفاع کا سلسلہ کھڑا کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا پلان یہ تھا کہ اگر ایک بار برٹش شہر میں آ گئے تو برٹش اپنا دفاعی حصار کھو دیں گے اور کشمیری دروازے کے پاس انگریزی فوج کا شکار کیا جائے گا۔ اس شکار کی تیاری جاری تھی۔ برٹش توپچیوں کو فصیل کے اوپر سے نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

پہلے بار جہادیوں کے گنڈاسے کام آ سکتے تھے۔ مولوی نوازش کے دو ہزار غازیوں کے علاوہ گوالیار سے خود کش غازیوں کا دستہ پہنچا تھا۔ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ ہم کچھ نہیں کھائیں گے، یا تو مر جائیں گے یا کافر ماریں گے۔ ایک اور ممتاز انقلابی سارجنٹ گورڈن تھے جو نومسلم تھے اور توپچیوں پر نشانے لگانے میں اتنا کامیاب رہے تھے کہ سپاہیوں نے انہیں نذر پیش کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ''دیر ہو چکی ہے۔ اگر پہلے تیاری کر لی ہوتی تو برٹش توپیں ایک فٹ نہ بڑھ سکتیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ان کو روکا جانا ناممکن ہے لیکن میں سب کے ساتھ یہیں شہادت پسند کروں گا''۔

پچھلے ہفتوں میں سپاہیوں کی ہونے والی واپسی کا مطلب یہ تھا کہ لڑنے والوں میں جہادی زیادہ ہو چکے تھے۔ ساٹھ ہزار کی فوج میں پچیس ہزار جہادی تھے۔ مرزا مغل دفاع کے لئے ''دین بچاؤ، دھرم بچاؤ، دہلی بچاؤ'' کے نعرے پر شہریوں کو اکٹھا کر رہے تھے۔ جہادی بھی مقامی لوگوں کو اکٹھا کر رہے تھے۔ دس ستمبر کو مرزا مغل نے تمام صوبیداروں کو شاہی فرمان بھجوایا۔ ''یہ اکٹھا ہونے کا وقت ہے۔ گائے کی تقدیس کو بچانے اور سور کی نجاست سے بچنے کا۔ ہر کوئی تیار ہو کر کشمیری گیٹ پہنچ جائے۔ اپنے گھٹیا دشمن اور بیچ کافر کو رسوا کرنے کا وقت ہے۔ ہم اکٹھے لڑیں ہیں اور ثابت قدم رہنا ہے۔ ہر پلاٹون کے ایک ایک سپاہی تک پیغام پہنچ جائے اور اگر کوئی بہانہ بنا کر الگ ہونے کی کوشش کرے تو فوری طور پر اسے رپورٹ کیا جائے''۔

گیارہ ستمبر کو برٹش توپوں نے اکٹھا ملکر فائر شروع کیا۔ دوپہر تک شہر کی فصیلوں میں دراڑ پڑنے لگے تھے۔ دھویں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ دیوار کے ٹکڑے گر کر نیچے خندق میں گر رہے تھے۔ کشمیر گیٹ کی توپوں کو خاموش کروا دیا گیا۔ دیوار میں دو جگہوں پر بڑے شگاف پڑ گئے تھے۔ بھوک کے باوجود انقلابی ایسی بے جگری سے لڑ رہے تھے جو پہلے نہیں دکھائی گئی تھی۔ برٹش فوج میں اس حملے میں مرنے والوں تعداد چار سو سے زائد ہو چکی تھی۔

چارلس گرفتھ نے لکھا، ''باغی اپنی فیلڈ گن کا اچھا استعمال کر رہے تھے۔ ہم پر گولہ باری کی جا رہی تھی۔ ہماری کئی توپیں آگ پکڑ چکی تھیں۔ ہمارا پلان کامیابی سے بڑھ رہا تھا لیکن باغی جتنی ہٹ دھرمی دکھا رہے تھے، وہ تصور سے زیادہ

تھی۔ ان کے دفاع کو ہم نے کھنڈر بنا دیا تھا لیکن وہ پھر بھی فائر کر رہے تھے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی جو ہم پر ہر سائیڈ سے حملہ آور ہوتے تھے۔ انہوں نے فصیل کو اس وقت تک نہیں چھوڑنا تھا جب تک ہماری سنگینوں کا نشانہ نہ بن جائیں"۔

اتوار تیرہ ستمبر کو واضح ہو چکا تھا کہ شہر پر حملے کا وقت آ چکا ہے اور شاید یہ اگلے روز ہو جائے۔ برطانوی فوجی سیڑھی لگا کر دیوار پر چڑھنے کی پریکٹس کرتے رہے۔ شہر کو لوٹنے کے اصول طے ہوئے۔ اس کام کے لئے پرائز ایجنٹ کو ووٹ سے چنا گیا۔ ایڈورڈ کیمپبل کو سب سے زیادہ ووٹ ملے۔ جنرل ولسن نے اعلان کیا کہ نکلسن حملے کی قیادت کریں گے۔ جو اگلے روز علی الصبح کیا جائے گا۔ چار جگہ سے شہر میں داخل ہوا جائے گا اور ہر جگہ سے داخل ہونے والا کالم مختلف منزل کا رخ کرے گا۔ پانچواں کالم ریزرو ہو گا۔ تھیو میٹکاف کے پاس اس کالم کی قیادت آئی جس نے جامعہ مسجد پر قبضہ کرنا تھا۔ یہاں پر شاہی محل پر حملہ کرنے کا بیس بنانا تھا۔ اس رات سب نے اپنے وصیتیں اور آخری خط لکھے۔ ایک نوجوان فوجی نے والدہ کو لکھا، "کل میں سیڑھی چڑھ رہا ہوں گا۔ کچھ لوگ مجھے گرانا چاہتے ہوں گے۔ ہتھیار مجھ پر تنے ہوں گے۔ اوپر سے گولیاں آ رہی ہوں گی۔ لیکن جلد سے جلد اوپر پہنچنا ہو گا تا کہ اپنی سنگین ان میں اتار سکوں۔ جب میں اس لمحے کا سوچتا ہوں تو ولولے سے خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ میں کسی کو گالی نہیں دوں گا۔ اس حالت کے جوش میں نکل ہی جاتی ہے۔ لیکن کوشش کروں گا کہ ایسا نہ ہو"۔

شہر میں اگلے روز کی تیاری مکمل تھی۔ بخت خان کابل دروازے کے پاس ریت کی بوریوں سے رکاوٹیں کھڑی کروا رہے تھے۔ اپنے حریف مرزا مغل سے دوستی کر لی تھی۔ مرزا مغل سے دو سو مزدوروں اور لکڑیاں بھیجنے کا کہا تھا جو انہیں فراہم کر دی گئی تھی۔ مرزا مغل نے دو محلے خالی کروا لئے تھے جہاں سے برٹش فوج کے داخل ہونے کی توقع تھی۔ مولوی محمد باقر نے "دہلی اردو اخبار" شائع کیا جو اس اخبار کی آخری اشاعت تھی۔ ان کے کالم میں لکھا تھا۔ "کافر بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ اہم چیز ہماری فوج کی شجاعت کی اور جذبے کی داد دینا ہے۔ انہیں دیکھیں کہ کافر پر روز کیسے حملے کرتے ہیں۔ اگر یہ مشکل ہمارے سر کھڑی ہے تو نہ جانے کونسا تکبر یا ناانصافی ہم سے سرزد ہوئی ہے جس کی سزا ملی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ خدا سے پناہ اور معافی مانگیں۔ اور مخلوقِ خدا سے زیادتی نہ کریں"۔ ایڈورڈ کیمپبیل نے اپنی بیوی کو لکھا کہ "یاد رکھنا، ہم پر خدا کی مہربانی ہے جو ہمارے ساتھ ہے۔ اسی نے اس مشکل وقت میں ہماری مدد کی۔ مجھے روز بروز احساس ہوتا جا رہا ہے کہ اس پر بھروسہ رکھنا کتنا اہم ہے۔ سکون صرف اسی کی ذات سے ملتا ہے۔ الارم بج گیا ہے اور میں سونے جا رہا ہوں۔ خدا ہماری حفاظت کرے"۔

آدھی رات کو برٹش فوجی بیدار ہو گئے۔ کالم بننے لگے۔ لالٹین کی روشنی میں جنرل ولسن کے احکامات پڑھ کر سنائے جانے لگے۔ ہر فوجی کو دو سو گولیاں لینی تھیں۔ اگر کوئی زخمی ہو جائے تو اس کو وہیں پڑا رہنے دینا تھا۔ لوٹا ہوا مال ایڈورڈ کیمپبیل کے پاس جمع کروانا تھا۔ قیدی کسی کو نہیں بنانا تھا، زندہ پکڑنے کی ممانعت تھی لیکن "انسانیت اور ملک کے وقار کی خاطر" خواتین اور بچوں کا قتلِ عام نہیں کرنا تھا۔ صبح تین بجے کالموں نے مارچ شروع کیا۔ بہادر شاہ ظفر کے پسندیدہ قدسیہ باغ کے پھلوں کے درخت چھپنے کے لئے استعمال ہو رہے تھے۔ توپوں کی گھن گرج جاری تھی۔ اس سے پچھلے دس روز میں یہ اتنی زیادہ نہیں برسیں تھیں۔ رات کی تاریکی ان کے گولوں کی چمک سے روشن تھی، ہوا میں بارود کی بو پھیلی تھی۔ آدھا گھنٹا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ صبح کی پو پھٹ رہی تھی۔ یکایک تمام توپیں طے شدہ وقت پر ایک ساتھ اکٹھی ہی خاموش ہو گئیں۔ قدسیہ باغ میں چھوٹے پرندوں کی چہچہاہٹ، گلاب اور پھولوں کی مہلک اور بارود کے سلفر کی بو

پھیلی تھی۔ نکلسن نے آرڈر دے دیا۔ برٹش فوج دہلی کی دیواروں کی طرف دوڑ رہی تھی۔

شہر کے اندر

''ہماری توپوں نے کام کر دیا تھا۔ اب فوجیوں کی باری تھی۔ پہلی رکاوٹ خندق تھی۔ بیس فٹ گہری اور پچیس فٹ چوڑی۔ اس کو پار کرنے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ اس میں دس منٹ لگے جس میں دشمن نے ہمارے جوان مار گرائے لیکن اس کے بعد ہم بڑھتے گئے۔ جیسے بھیڑیوں کا غول حملہ کر رہا ہو۔ دشمن دیواروں پر ویسے جمع تھا جیسے شہد کی مکھیاں چھتے پر۔ سیاہ چہرے اور سفید پگڑی والے تلواریں اور سنگینیں لہرا رہے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر پریشان تھے۔ تین بار انہوں نے ہماری سیڑھیاں گرا دیں۔ شگاف تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ اس کے پیچھے انہوں نے دفاعی حصار بنایا تھا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ بائیں ہاتھ سے سیڑھی پکڑ کر اور دائیں میں ریوالور فائر کرتے ہوئے میں چڑھتا گیا۔ تلوار بازو کے نیچے تھی۔ انہوں نے اینٹیں گرانا شروع کر دیں۔ میں اور فٹزجیرالڈ اکٹھے شگاف سے داخل ہو گئے تھے۔ میں کشمیری دروازے کی طرف مڑ گیا۔فٹزجیرالڈ اسی وقت گولی سے مارا گیا''۔ یہ رچرڈ بارٹر کی ڈائری سے لیا گیا اقتباس ہے جب وہ دہلی میں داخل ہوئے۔

کشمیری دروازے کا ایک حصہ بارود کے دھماکے سے اڑا دیا گیا۔ برٹش دہلی میں داخل ہو گئے۔ اس دستے کی قیادت ستائیس سالہ کیپٹن فلپ سالکیڈ کر رہے تھے جو اسی دروازے سے گیارہ مئی کو فرار ہوئے تھے۔ باقی دروازہ کھولنے کی کوشش میں کیپٹن ہلاک ہو گئے۔ ان میں سے ایک شدید زخمی فوجی اندر کی طرف بارود رکھ کر آگ دکھانے میں کامیاب ہو گئے۔ کشمیری دروازے کے دونوں پلو قبضے سے اکھڑ گئے۔ صبح کے پونے چھ بجے دہلی کے حفاظتی حصار توڑنے میں کامیابی کے بعد بگل بجا دیا گیا۔ یہ کینڈال کوگ ہل کی قیادت میں تیسرے کالم کے لئے دہلی میں ہلا بولنے کے لئے اشارہ تھا۔ کینڈال کوگ ہل منیوں سے انتقام کی آگ میں جل رہے تھے۔ گیٹ پر دس منٹ تک لڑائی ہوئی جس کے پاس گیٹ برٹش کے پاس تھا۔ دہلی کے داخلی دروازے پر یونین جیک لہرا دیا گیا۔

لیکن اس سے آگے برٹش کو سخت مزاحمت کا سامنا تھا۔ دونوں طرف سے گولیوں کا تبادلہ جاری تھا۔ نکلسن کابل اور لاہور گیٹ پر قبضے کے لئے الگ ہو گئے جہاں میجر ریڈ کی قیادت میں چوتھا کالم ان سے ملنا تھا۔ جنرل ولسن کے پلان کے

مطابق دہلی کے مغربی اور شمالی حصے پر قبضہ لنچ تک ہو جانا تھا۔

تھیو میٹکاف گورکھا فوج کو لے کر جامعہ مسجد کی طرف بڑھے۔ تیسرا کالم دہلی کالج کے راستہ لال قلعے کی طرف۔ سات بجے برٹش کے لئے معاملہ خراب ہونے لگا۔ برٹش کا خیال تھا کہ سب سے مشکل مرحلہ دیوار سے اندر جانا ہو گا اور یہ کام آسانی سے ہو گیا تھا۔ لیکن اگلا مرحلہ جس میں سڑکوں اور گلیوں میں آگے بڑھنا تھا، زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ انقلابیوں نے بڑی قوت سے جوابی حملہ کیا اور برٹش فوج کو نکالنے میں تقریباً کامیاب ہو ہی گئے تھے۔ بخت خان اور مرزا مغل نے اچھی تیاری کی تھی۔ ہر دروازے اور کھڑکی سے گولیوں کا سلیوٹ ملا۔ کہیں سڑک کے موڑ پر سے گولا آ جاتا۔ افسر اور جوان گرتے گئے۔ لال قلعے کی طرف پیشقدمی کرنے والے پسپا ہو گئے۔

تھیو کے کالم کو جہادیوں نے آن لیا جن کے پاس ایک توپ، تلواریں اور گنڈاسے تھے۔ آدھے گھنٹے کی جھڑپ کے بعد اسے بھی پسپا ہو کر کشمیری گیٹ جانا پڑا۔ نکلسن کے دستے کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ نکلسن کو بغل کے قریب گولی لگی۔ زخمی نکلسن کو دو قلیوں نے اٹھا کر فیلڈ ہسپتال پہنچا دیا۔

کابل گیٹ پر حملے کو بخت خان کی بریلی بریگیڈ کے سامنے پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔

دوپہر بارہ بجے تک برٹش فوج کو روک دیا گیا تھا۔ برٹش فوج کے حوصلے پست پڑ گئے تھے۔ اگرچہ ایک چوتھائی دہلی پر ان کا قبضہ تھا لیکن پوری جنگ میں اتنا بھاری نقصان پہلے نہیں ہوا تھا۔ حملہ کرنے والے فوجیوں میں سے ایک تہائی اس روز شام تک مارے گئے تھے۔ اس کا مطلب 1100 فوجی تھا جس میں 60 برٹش افسر بھی شامل تھے۔

دوپہر کے بعد برٹش کے لئے مزید بری خبر آئی۔ میجر ریڈ نہ صرف لاہور گیٹ پر کنٹرول نہیں حاصل کر سکے تھے بلکہ ان کا ساتھ دینے والے وہ سپاہی جو کشمیر سے لڑنے کے لئے آئے تھے، وہ بھاگ گئے تھے۔

جنرل ولسن پریشان لگ رہے تھے۔ وہ غور کر رہے تھے کہ حملہ ختم کر دیا جائے، پسپائی اختیار کی جائے اور دہلی کو خالی کر دیا جائے۔ لیکن دوسرے افسروں نے انہیں روک دیا۔ جب ہسپتال میں پڑے زخمی نکلسن کو پتا لگا کہ ولسن دہلی خالی کرنے کا سوچ رہے ہیں تو آگ بگولہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ اگر میرے میں ہمت ہوتی تو اسی وقت ولسن کو گولی مار آتا۔

دہلی کے جن علاقوں پر برٹش قابض ہو چکے تھے، وہاں کے ہر گھر کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ لڑنے کی عمر والے کسی بھی مرد کو مارا جا رہا تھا۔ وہ دہلی والے جو چار مہینوں سے جاری انارکی ختم ہونے کی امید میں تھے کہ برٹش کی واپس سے سب کچھ نارمل ہو جائے گا، انہیں بڑا دھچکا لگنا تھا۔ کسی کو توقع نہیں تھی کہ برٹش قتل و غارت کریں گے۔ وہ لوگ بھی جو نہ صرف برٹش کے حق میں تھے بلکہ انگریز فوج کے لئے جاسوسی نیٹ ورک میں فعال تھے، محفوظ نہیں تھے۔ چارلس گرفتھ، جو کوئی امن پسند شخص نہیں تھے، لکھتے ہیں، ''یہ خوفناک وقت تھا۔ ہمارے فوجی پاگل ہوئے ہوئے تھے۔ خاص طور پر وہ جن کے قریبی عزیز بغاوت میں مارے گئے تھے، ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ جو کیا گیا، وہ کسی کرسچن کو زیب نہیں دیتا۔ کوئی رحم نہیں دکھایا گیا۔ کسی کو قیدی نہیں بنایا گیا۔ یہ صفایا تھا۔ عالمی تاریخ کا سفاکانہ وقت۔ کون لڑنے والا تھا اور کون نہیں؟ کون دوست اور کون دشمن؟ ان میں تمیز کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی''۔

بومبے ٹیلی گراف میں ایک فوجی نے جنرل ولسن کے احکامات کو تنقید کا نشانہ بنایا، ''بچوں اور خواتین کو قتل کرنے سے روکنے کا حکم غلطی تھی۔ ہمارے سامنے انسان نہیں شیطان تھے۔ جنگلی جانور جو کتے کی موت مرنے کے مستحق تھے۔ جو لوگ ہمارے لوگوں کے ہتھے چڑھے، وہ ہماری سنگینوں کا نشانہ بنے اور ان کی تعداد کم نہیں تھی۔ ایک گھر میں چالیس سے پچاس لوگ چھپے ملے۔ یہ لڑاکا نہیں تھے لیکن ایسے شہر کے باسی تھے جن کا خیال تھا کہ ہم رحمدلی دکھانے والے لوگ ہیں۔ میں خوشی خوشی یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انہیں مایوسی ہوئی تھی''۔

پندرہ اور سولہ ستمبر کو دہلی کی قسمت کا فیصلہ نہیں ہوا۔ انگریز فوج آگے نہیں بڑھ سکی۔ لیکن دہلی والوں میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ برٹش فوج کو دہلی سے واپس باہر دھکیل دینے کے لئے ایک اچھے جوابی حملے کی ضرورت تھی۔ دہلی والے انقلابی سپاہیوں کو برا بھلا کہہ رہے تھے کہ وہ ایسا کیوں نہیں کر پا رہے۔

برٹش بمقابلہ انقلابی۔ دہلی میں یہ جوڑ ابھی مقابلے کا تھا۔ سولہ ستمبر کو اس جنگ کا اہم فیصلہ لیا جانا تھا۔ اور چار ماہ پہلے کی طرح یہ اہم فیصلہ ایک بار پھر بہادر شاہ ظفر کے پاس تھا۔

فیصلہ

دلی شہر میں جنگ جاری تھی۔ برٹش افواج کو شہر میں داخل ہوئے تیسرا دن تھا۔ انہیں باہر دھکیلنے کے لئے ایک بڑے اور موثر جوابی حملے کی ضرورت تھی۔ 16 ستمبر 1857 کو شہر کے لوگ لال قلعے کے باہر اکٹھے ہونے لگے۔ ان کے ساتھ جہادی بھی تھے اور انقلابی سپاہی بھی۔ مولوی سرفراز اور انقلابی افسر ملکر شاہی محل میں گئے اور بہادر شاہ ظفر سے درخواست کی کہ وہ بڑے حملے میں ان کی قیادت کریں۔ "اگر آپ ساتھ چلیں گے تو پوری فوج، دہلی کے تمام شہری اور ملک بھر کے لوگ آپ کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے۔ آپ کی خاطر لڑیں گے، جان دے دیں گے اور انگریز کو نکال باہر پھینکیں گے"۔ مجمع بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ کے پاس بندوقیں تھیں، کچھ کے پاس تلواریں اور کچھ کے پاس صرف ڈنڈے۔

محل کے اندر ماحول سنجیدہ تھا۔ چودہ ستمبر کو مرزا مغل نے ظفر کو پیغام بھجوایا تھا کہ کسی طرح فنڈ کا بندوبست کریں تا کہ سپاہیوں کو کھلایا پلایا جا سکے کہ وہ لڑنے کے قابل ہوں۔ ظفر نے چاندی کے ہودے اور کرسیاں اور گھوڑے کی زین مرزا مغل کو دے دی تھی کہ ان کو بیچ کر گزارا چلا لیں۔ ان کے پاس اب کچھ اور نہیں بچا۔ گولے محل تک پہنچ رہے تھے اور خوراک کی آمد بند ہو چکی تھی۔ محل میں سلاطین بھی فاقہ زدگی کا شکار تھے۔

اور اب مولوی اور جہادی، سپاہی اور شہری ظفر کے پاس اکٹھے ہوئے تھے اور ایک نئی درخواست کر رہے تھے کہ وہ خود ذاتی طور پر حملے میں شرکت کریں۔ بہادر شاہ ظفر نے ایسا کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ نہ ہی عمر کے اس حصے میں تھے جس میں لوگ جنگ میں حصہ لیتے ہیں۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کریں۔ عید الاضحیٰ کے بعد سے وہ عجیب ذہنی کیفیت میں تھے۔ اور اب فیصلے کی گھڑی تھی۔ مان لیں یا انکار کر دیں۔ بادشاہ ہچکچاہٹ میں تھے۔

''آپ کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ آپ پکڑ لئے جائیں گے۔ ایک شرمناک اور بے عزتی والی موت کیوں؟ کیوں نہ لڑتے ہوئے مرا جائے اور ہمیشہ کے لئے نام بنا لیا جائے؟''

بہادر شاہ ظفر نے چار ماہ قبل اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کر کے اس انقلاب کی سربراہی قبول کی تھی۔ اس بار ایک مرتبہ پھر انہوں نے اتنا ہی اہم فیصلہ لینا تھا۔

سوچ بچار کر کے بادشاہ نے اعلان کر دیا۔ بارہ بجے وہ فوج کے ساتھ نکلیں گے۔ سب کے ساتھ نہیں، بلکہ سب سے آگے۔ دہلی شہر تیاری کر لے۔ دلی کو حملہ آوروں سے خالی کروانے کی اس جنگ میں قیادت بادشاہ خود کریں گے۔

جیسے ہی بادشاہ نے ارادہ ظاہر کیا، لوگ اکٹھے ہونے لگے۔ باغی، غازی، شہری۔ کہا جاتا ہے کہ ستر ہزار لوگ جمع تھے۔ اتنی بڑی تعداد میں دہلی والے کبھی اکٹھے نہیں ہوئے تھے۔ حملے کی قیادت کرنے کے لئے بادشاہ کا تموجن لایا جا رہا تھا۔ سواری تیار ہو رہی تھی۔

حکیم احسن اللہ خان نے بادشاہ کے سرگوشی کی ''اگر آپ لڑائی کی قیادت کرنے گئے تو کل کو برٹش کے جیتنے پر کیا کہہ سکیں گے۔ آپ کا بھی وہی حشر ہو گا جو ان سب کا۔ اور خدانخواستہ اگر آپ سپاہیوں کے ساتھ چلے گئے تو ان لوگوں نے پیچھے سے خود بھاگ جانا ہے۔ پکڑے آپ ہی جائیں گے۔ یہ تو خود بھگوڑے ہیں۔ ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کو یہ وعدہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ ان کی لگائی گئی آگ ہے۔ آپ اس میں خود کو کیوں جلاتے ہیں۔ انہیں اس سے خود نمٹنے دیں''۔

تذبذب کے شکار ظفر پر حکیم کے الفاظ کام کر گئے۔ فیصلہ ہو گیا۔ سعید مبارک شاہ لکھتے ہیں، ''بادشاہ نے مجمعے کو چھوڑا اور محل کے اندر چلے گئے کہ انہوں نے ظہر کی نماز ادا کرنی ہے۔ بادشاہ پھر واپس نہیں آئے۔ مجمع انتظار کرتا رہا، پہلے کنفیوز ہوا، پھر پریشان اور پھر چھٹ گیا۔ اور یوں، دہلی میں جاری 1857 کا غدر، بغاوت، انقلاب، جنگ آزادی اسی کے ساتھ ہی تمام ہو گئی''۔

بہادر شاہ ظفر کے گیارہ مئی کو لئے گئے فیصلے نے انیسویں صدی میں برٹش کے ساتھ سب سے بڑی جنگ چھیڑی تھی، ویسے ہی سولہ ستمبر میں لیا گیا یہ فیصلہ اس کا اختتام ثابت ہوا۔ اردو زبان میں محفوظ ہر ذریعہ یہی بتاتا ہے کہ اس فیصلے کے ساتھ ہی انقلابیوں کی مزاحمت ماند پڑ گئی۔

اس مرحلے تک انقلابی ہارے نہیں تھے۔ ہارنے کے قریب بھی نہیں تھے۔ انگریز فوج مشکل میں تھی، مورال اور حوصلہ ختم ہو رہا تھا۔ گلی کوچوں میں لڑنے کا تجربہ نہیں تھا۔ جوان اپنے افسروں سے حکم عدولی کر رہے تھے۔ تین روز سے دونوں فوجیں آمنے سامنے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہی تھیں۔ بہادر شاہ ظفر کی عدم اعتمادی کا مطلب یہ تھا کہ انقلابیوں نے آنکھیں جھپکا لیں تھیں۔

دہلی والوں کو یقین ہو گیا کہ خاتمہ قریب ہے۔ لوگ سامان اٹھا کر دہلی چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ اجمیری دروازے پر نکلنے والوں کی لمبی قطار تھی۔ چھوڑ کر جانے والے سپاہیوں کا بھی ریلا تھا۔ بریلی بریگیڈ نے اپنا اسلحہ تباہ کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ انگریز کے ہاتھ نہ آئے۔ نمیچ اور بریلی بریگیڈ نے دہلی چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔

شاہجہاں آباد کے لال قلعے میں 16 ستمبر 1857 کی رات وہ آخری رات تھی جب کوئی مغل بادشاہ اس قلعے میں سویا۔

بہادر شاہ ظفر کی بیٹی کلثوم زمانی بیگم سے آنے والی روایت بتاتی ہے کہ اس روز ظفر تسبیح خانے گئے۔ عبادت کرتے رہے اور سوچتے رہے۔ باہر لڑائی کی آوازیں قریب ہوتے لگ رہی تھیں۔ گیارہ بجے انہوں نے اپنی بیٹی کو بلایا۔

"ہر طرف گولیوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ اپنے شوہر کے ساتھ نکل جاؤ۔ حفاظت کے لئے دعا کی۔ کچھ زیور دئے اور ہمیں نکل جانے کا کہا۔ ہمارا کاروان رات گئے نکلا۔ ہم کورالی کے گاؤں پہنچے جہاں جو کی روٹی اور دہی کھایا۔ اگلے روز میرٹھ کی طرف جا رہے تھے تو گجروں کی ایک پارٹی نے ہم پر حملہ کر دیا اور سب کچھ چھین لیا۔ تن کے کپڑے تک نہ چھوڑے"۔

سترہ ستمبر کو فجر کے وقت بہادر شاہ ظفر نے خاموشی سے قلعہ چھوڑ دیا۔ نہ اپنے وزیرِاعظم کو بتایا اور نہ ہی ملکہ عالیہ زینت بیگم کو۔ قدیم نوادرات اور آبائی خزانے کا کچھ حصہ ساتھ رکھا۔ اس میں ایک ڈبے میں نبی کریمﷺ کی داڑھی کے تین بال تھے جو تیمور کے گھرانے میں چودہویں صدی سے چلے آ رہے تھے اور بادشاہ کو ان سے بے حد لگاؤ تھا۔ چند خدام کے ہمراہ اپنی پالکی پر نکلے۔ کشتی میں جمنا پار کیا۔ ان کی منزل نظام الدین اولیاء کی درگاہ تھی۔

اور یوں ۔۔۔ بادشاہ کی لال قلعہ سے روانگی کے ساتھ ہی تیموری خاندان کی دہلی سلطنت اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔

دہلی میں منظم مزاحمت دم توڑ گئی۔ برٹش فوج کو اب شہر فتح کرنے کے لئے جگہ جگہ پر مختلف گروہوں کا سامنا تھا۔ انہیں اس سے اگلے ہی روز بڑی غیر متوقع طور مدد ملی جس نے اس جنگ کو طے کر دیا۔ یہ مدد مقامی توہمات اور آسمانی مظہر کی تھی۔ دونوں طرف لڑنے والوں کو اس کا علم نہیں تھا لیکن اس سے اگلے روز 18 ستمبر 1857 کو مکمل سورج گرہن کا دن تھا۔

دہلی کی فتح

''مجھے پتا تھا کہ یہ باغی سپاہی صرف تباہی لائیں گے۔ شروع سے ہی مجھے خدشہ محسوس ہو رہا تھا اور میرا خوف ٹھیک نکلا۔ یہ انگریز کے آنے سے پہلے ہی بھاگ گئے۔ میں ایک فقیر اور صوفی ہوں لیکن میری رگوں میں عظیم جنگجو نسل کا خون بہتا ہے۔ میں خون کے آخری قطرے تک لڑ سکتا ہوں۔ میرے آباء نے اس سے بھی برے دن دیکھے ہیں اور دل نہیں ہارا۔ لیکن میں نے نوشتہ دیوار پڑھ لیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مغلوں کی شان اور ان کا وقت ختم ہو چکا۔ مجھے کوئی شک نہیں کہ تیمور کے گھر میں ہندوستان کے تخت پر بیٹھنے والا آخری ہوں۔ مغلوں کا چراغ بجھ رہا ہے۔ جب مجھے یہ سب معلوم ہے تو مزید خون کیوں بہایا جائے؟ اور یہ وہ وجہ ہے جس لئے میں نے قلعہ چھوڑ دیا۔ اب یہ ملک اللہ کے حوالے ہے۔ وہ اسے اس کو دے گا، جسے وہ پسند کرتا ہو گا''۔

پیرزادوں کے پاس ناشتہ کرنے کے بعد بادشاہ نے روتے ہوئے انہیں یہ بتایا۔ بادشاہ نے درگاہ کے رکھوالے نظامی خاندان کے سپرد نوادرات کیں کہ وہ ان کی حفاظت کریں۔ اور پھر پالکی میں مہروالی پر قطب صاحب کی درگاہ کا رخ کیا۔

مرزا الٰہی بخش گھوڑا دوڑاتے آئے کہ اس طرف نہ جائیں، گجر اس راستے میں ہر ایک کو لوٹ رہے ہیں۔ اگرچہ الہی بخش درست کہہ رہے تھے لیکن بہادر شاہ کو یہ نہیں پتا تھا کہ الہی بخش درحقیقت ہوڈسن کے لئے کام کر رہے تھے اور اسی مقصد کے لئے آئے تھے۔ انہوں نے ہوڈسن سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے کزن بہادر شاہ ظفر کو شہر سے باہر جانے سے روکیں گے۔ ہوڈسن بہادر شاہ کو پکڑ کر امپیریل جنگی ہیرو بننا چاہتے تھے اور اس کے لئے بادشاہ کو زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ ہوڈسن نے یہی بات ملکہ عالیہ زینت محل اور ان کے والد مرزا قلی خان سے بھی کی تھی۔ زینت نے حامی بھری تھی اور اس کے بدلے میں تین مردوں، اپنے شوہر، بیٹے اور والد کی جان بخشی کی ضمانت مانگی تھی۔ جان بخشی کی اس فہرست میں ظفر کے دوسرے بیٹے شامل نہیں تھے۔

بہادر شاہ ظفر قائل ہو کر واپس ہو لئے۔ ان کی پالکی نظام الدین پہنچی۔ یہاں پر زینت محل بھی آ گئیں۔ دونوں ظفر کے آباء کے عظیم مقبرے پر گئے جو تین سو سال پرانا تھا اور سولہویں صدی کے درمیان بنایا گیا دوسرے مغل بادشاہ ہمایوں کا سنگِ مرمر کا مزار تھا اور دہلی کی شاندار ترین یادگار تھی۔

دہلی میں جنگل کی آگ کی طرح خبر پھیل گئی کہ بہادر شاہ ظفر نے وہ کر لیا ہے جس کی وہ دھمکی دیتے آئے تھے۔ ظفر نے قلعہ چھوڑ دیا ہے۔

اجمیری دروازے سے شہر سے فرار ہونے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ کئی نے انگریزوں کے قبضے میں آ جانے والے کشمیری گیٹ کا انتخاب اس امید پر کیا کہ اس طرف انگریز شہر کے باہر لوٹنے والے قبائلیوں سے بہتر ہوں گے۔ یہ غلط نکلے۔ بہت سے آدمی اور لڑکے انگریز فوج نے دروازے پر ہی مار دئے۔ بچوں اور خواتین کو جانے دیا جاتا، لیکن تمام پیسے، زیور اور سازوسامان وہیں رکھوا کر جانے کی اجازت ملی۔

دہلی کے مہاجرین نے کمال اور میرٹھ کی سڑکوں کا رخ کیا۔ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں کہ نواب حامد علی خان (جو دہلی کی شیعہ برادری کے سربراہ تھے) اس شام ان کے پاس آئے اور کہا کہ اپنے خاندان سمیت دہلی سے کوچ کر جائیں۔

''ابھی تک گھر میں کیا کر رہے ہو؟ بادشاہ نے دہلی چھوڑ دیا اور اب عوام بھی جا رہے ہیں۔ خدا کے لئے آج ہی نکل پڑو۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ دہلی میں قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ میں اپنے بیوی بچوں سمیت نکلنے لگا ہوں۔ اپنی فیملی کی خواتین کو ہماری سواری میں بٹھا دو۔

میرے والد نے نواب کی بات مان لی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ والد نے کہا کہ سب نکل پڑیں۔ سب انہی کپڑوں میں نکل پڑے جو انہوں نے پہنے تھے۔ میری بیوی نے شادی کے وقت سلوایا مہنگا جوڑا اور زیورات کا ڈبہ ساتھ لے لیا۔ والدہ نے کچھ بھی نہیں۔ ساتھ ایک روئی کا گدا رکھ لیا جو انہوں نے بیل گاڑی میں بچھا لیا۔

سڑکوں پر ہولناک مناظر تھے۔ ہم نے لوگوں کی بے چارگی کو دیکھا، خوف کو اور غربت کو۔ وہ خواتین جو پردہ کرتی تھیں اور کبھی سڑکوں پر نہیں آئی تھیں، انہیں زیادہ چلنے کی عادت ہی نہیں تھی۔ بچوں کی چیخ و پکار تھی۔ یہ ایسا دلخراش منظر تھا جو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

ہم سب دہلی دروازے سے باہر نکلے۔ باہر دوزخ کے مناظر تھے۔ ہزاروں عورتیں اور ان کے چھوٹے بچے۔ ان کے ساتھ خوفزدہ اور پریشان مرد۔ ہر کوئی بس نکلنے کی فکر میں تھا۔ کسی کو ہوش نہیں تھی کہ کس حالت میں ہے، کہاں جانا ہے۔ بس حرکت میں تھے۔ ہمارا گروپ برف خانے تک پہنچ گیا۔ رات وہاں گزاری۔ اسی پر خوش تھے کہ سونے کی جگہ مل گئی۔ ہم میں سے کسی نے کچھ نہیں کھایا تھا''۔

اس شام کو بخت خان کی فوج نے کشن گنج پر اپنی پوزیشن چھوڑ دی۔ جنرل ولسن سب سے زیادہ اس جگہ کے بارے میں پریشان تھے۔ اب انہیں یہاں پر خطرہ نہیں تھا۔ شہر کے مغربی حصے میں مزاحمت ہو رہی تھی لیکن مشرقی حصے میں انگریز افواج بڑھ رہی تھیں۔ سترہ تاریخ کو چاندنی چوک تک کا علاقہ لیا جا چکا تھا۔

برٹش آگے بڑھتے تھے تو اس علاقے کے گھر لوٹنے کے لئے رک جاتے تھے۔ خوش قسمت مکینوں کو نکال دیا جاتا تھا، بدقسمت کو مار دیا جاتا تھا۔ گھر میں کوئی نہیں بچتا تھا۔ جہاں برٹش فوج بڑھتی جا رہی تھی، وہ علاقہ سنسان ہوتا جا رہا تھا۔

اٹھارہ ستمبر کو سورج گرہن ہوا۔ پانچ منٹ کے لئے مکمل۔ تین گھنٹے رہنے والے اس واقعے کا گہرا اثر ہوا۔ انگریز سپاہی اس سے نروس ہوئے لیکن مقامی آبادی کے لئے یہ بڑا واقعہ تھا۔ آج تک بھی برِصغیر میں سورج گرہن سے کئی توہمات وابستہ ہیں۔ انڈیا میں کئی اونچی ذات کے ہندو سورج گرہن میں گھر سے باہر تک نہیں نکلتے اور مندر بند کر دئے جاتے ہیں۔ اس ماحول میں، جب جوتشیوں کا بڑا اثر تھا، یہ واقعہ بہت اہمیت کا حال تھا۔ ایک برا شگون اور فلک سے ناراضگی کی علامت۔

اس دن کی تیز بارش میں باغی سپاہی آگرہ کی طرف بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ ان خونخوار برٹش فوجیوں سے اور ان کے ہندوستانی اتحادیوں سے، جو اپنی خون آشامی میں انگریز سے کم نہ تھے، دور جا رہے تھے۔

چارلس گرفتھ کے مطابق، '' گرہن کی تاریکی ہمارے لئے ان وہمی لوگوں کو شکست دینے کے لئے خدا کی طرف سے بھیجی گئی غیبی مدد تھی۔ انقلابی فوجیوں میں بریلی بریگیڈ اور نمیچ بریگیڈ کے سپاہیوں نے گوالیار کا رخ کیا۔ انگریز فوج کو ملنے والی مزاحمت کم پڑ گئی تھی۔ جب فائرنگ رکتی تھی تو انسانوں کے بھاگنے کی آوازیں سنی جا سکتی تھیں، جو اس شہر سے نکلنے کے درپے تھے جو ہمارے ہاتھ آنے والا تھا''۔

انیس ستمبر کی دوپہر برن قلعے پر انگریز فوج نے قبضہ کر لیا۔ ایک روز پہلے انہیں یہاں پر بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ شام کو دہلی کا بینک بھی انگریز فوج کے پاس تھا اور اگلی صبح، بیس ستمبر کو شاہی محل پر حملے کے لئے تیار تھے۔

بیس ستمبر کو برٹش لال قلعے کی طرف پیشقدمی کر رہے تھے۔ صبح دس بجے ان کی فارورڈ پارٹی نے قلعے کے دروازے پر بارود لگا دیا۔ کوئی مزاحمت نہیں مل رہی تھی۔ محل کے زیادہ تر محافظ بھاگ چکے تھے۔ صرف چند دھن کے پکے جہادی رہ گئے تھے جو خلیفہ وقت کا تخت دوسروں کے حوالے کرنے سے مرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

زوردار دھماکے سے محل کا دروازہ نیچے آن گرا۔ اس پارٹی کی قیادت ایڈورڈ کیمپبیل کے ساتھ افغان سردار میر خان کر رہے تھے۔ کیپٹن فریڈ میسے لکھتے ہیں کہ ''وجیہہ، عقابی آنکھوں والے اور سیاہ داڑھی والے میر خان نے جنگ میں بہت دلیری دکھائی تھی۔ اب انہیں بادشاہ کو پکڑنے کا شوق تھا۔ میں ان کے ساتھ محل میں پھرتا رہا۔ محل کی دیواروں کے اندر ایک پورا شہر تھا۔ ہم توقع کر رہے تھے کہ کہیں سے کوئی فائر آئے گا لیکن صرف دو لوگوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ہمارے دوست میرخان نے انہیں گولی مار کر یوں گرا دیا جیسے تیتر کا شکار کیا جاتا ہے۔ ایک اور شخص نظر آیا جو غیر مسلح تھا اور بنجارا لگتا تھا۔ میں نے وعدہ کیا کہ ہم اسے نہیں ماریں گے۔ وہ محل میں راستہ دکھائے۔ وہ بڑھا ہی تھا کہ فائر ہوا اور وہ گر پڑا۔ میر خان نے اسے پیچھے سے گولی مار دی تھی۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ میر خان اسے تڑپتا دیکھ کر قہقہہ لگا رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ دشمن کے بدمعاش کے ساتھ کئے گئے وعدے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی''۔

اگرچہ ہوڈسن کو معلوم تھا کہ بہادر شاہ کہاں ہیں اور براہِ راست الٰہی بخش کے ساتھ رابطے میں تھے لیکن محل پر حملہ کرنے والی ٹیم کو یہ انفارمیشن نہیں دی گئی تھی۔ برٹش فوجی محل کی راہداریوں میں اور کمرہ کمرہ کنٹرول لیتے گئے اور حملہ آوروں کو یہ امید تھی کہ بہادر شاہ مل جائیں گے۔

محل کو لوٹا جا رہا تھا۔ فرنیچر، خواتین اور مردوں کے لباس، برتن، فانوس، آرائش کا سامان، کتابیں، مسودے، تصاویر، پستول، زیورات تلاش کئے جا رہی تھے۔ شام تک تھک ہار کر فوجی آرام کے لئے چلے گئے۔ جنرل کو پیغام بھجوا دیا گیا کہ محل پر قبضہ کر لیا گیا ہے۔

اس شام کو جامعہ مسجد میں جشن منعقد ہوا۔ فاتح انگریز اور مقامی ہندوستانی فوجیوں کی ناچ کی محفل سجی، محراب کے پاس فتح کی آگ جلائی گئی۔ جنرل ولسن اور ہیڈکوارٹر کے سٹاف نے رات کا کھانا شاہی محل کے دیوانِ خاص میں تناول کیا۔ ملکہ وکٹوریا کے لئے دعا پڑھی گئی۔ لاہور کو بھیجے گئے ٹیلی گرام میں لکھا گیا تھا کہ، ''ہماری جدوجہد کامیاب رہی ہے۔ بنگال آرمی کی پھیلائی گئی بغاوت کو اپر انڈیا سے فرو کر دیا گیا ہے۔ کلائیو اور لیک کے دن بحال کر دئے گئے ہیں۔ خدا نے ہماری بہت مدد کی۔ ملکہ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رہے''۔

یہ خبر دہلی پر حملہ کرنے والی فوج کے قائد نکلسن تک پہنچائی گئی جو اس دوران زخمی ہوئے تھے۔ ان کی حالت بگڑ رہی تھی اور سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ''دلی کی فتح کی خبر سننا مرنے سے پہلے میری آخری خواہش تھی جو پوری ہو گئی ہے''۔ تین روز بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی قبر پر جو سل لگائی گئی، وہ اس سنگِ مرمر کی تھی جسے بہادر شاہ ظفر کے پسندیدہ مہتاب باغ سے لوٹا گیا تھا۔

شکل 20: 1858 میں لی گئی تصویر۔ یہ دریائے جمنا کے اوپر کشتیوں کا پل ہے جو دہلی کو ہندوستان کے مشرق سے ملاتا تھا۔

کوئی نہ بچنے پائے

برٹش قبضے کے وقت مولوی محمد باقر کے بیٹے اور شاعر محمد حسین آزاد اپنی فیملی کے ساتھ گھر میں تھے۔

''فوجی گھر میں اچانک گھسے، بندوق لہرائی اور چیخے، نکل جاؤ۔ میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ بھرا پرا گھر تھا اور میں ساکت کھڑا تھا۔ کیا ساتھ لے جاؤں۔ جواہرات اور زیورات کو ہم نے ڈبے میں بند کر کے کنویں میں پھینک دیا تھا۔ میری نظر اپنے استاد ذوق کی غزلوں کے مجموعے پر پڑی جو ان کے پاس تھا (ذوق فوت ہو چکے تھے اور آزاد کا اس مجموعے کو ابھی شائع کرنے کا ارادہ تھا)۔ میں نے سوچا، ''حسین، اگر خدا نے مدد کی اور بچ گئے تو باقی مال و دولت تو واپس مل جائے گا لیکن ایسا استاد پھر کب آئے گا۔ یہ غزلیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گی۔ ان کے ذریعے ذوق مرنے کے بعد بھی زندہ رہیں گے۔ اگر یہ نہ بچیں تو میرے استاد بھی ختم ہو جائیں گے''۔ میں نے اس پیکٹ کو بغل تلے دبایا۔ اس گھر کو بائیس نیم مردہ ارواح کے ساتھ چھوڑ کر میں نکل لیا۔ آدم خلد سے نکلے تھے اور دہلی بھی خلد تھا۔ یہ ابنِ آدم کا خلد سے نکلنا تھا''۔

وہ رات آزاد کی فیملی نے بھی برف خانے گزاری۔ ان کے پاس کچھ آٹا تھا۔ ٹوٹے ہوئے کسی مرتبان میں آٹا گوندھ لیا تھا۔ پتوں اور ٹہنیوں کے ساتھ آگ جلائی تھی اور دوسرے پناہ گزینوں سے اس رات ادرک، نمک اور مرچ مانگ کر چٹنی بنا کر بھوک مٹائی تھی۔ آزاد کہتے ہیں کہ اس رات کی آدھ پکی ہوئی روٹی اور ادرک کی چٹنی زندگی میں کھائی بہترین بریانی، قورمے اور پلاؤ سے زیادہ اچھی لگی تھی۔

اگلے روز اپنی فیملی کو آگے روانہ کر کے اور ایک بڑا خطرہ مول لے کر آزاد واپس دہلی آ گئے۔ انہیں اپنے والد مولوی محمد باقر کی تلاش تھی۔ ان کی کسی سکھ افسر سے ملاقات ہوئی جس نے مدد کا وعدہ کیا۔ بھیس بدلوا کر وہ افسر انہیں وہاں لے گیا جہاں قیدی رکھے گئے پھانسی دئے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ جب باقر کو لے جایا رہا تھا تو باپ بیٹے کی نظریں آخری بار ایک دوسرے سے ملیں۔

مولوی محمد باقر کی پھانسی کے بعد آزاد نے دہلی چھوڑ دیا۔ ان کی اگلی زندگی ایک شہر سے دوسرے شہر اکیلے گھومتے اور شدید غربت میں گزری۔ مدراس، نلگری ہل، لکھنو اور پھر لاہور۔ چار سال تک انہوں نے اپنے استاد کی غزلوں کا مجموعہ نہیں چھوڑا۔

انہیں لاہور میں ڈاکئے کے طور پر ملازمت 1861 میں ملی اور پھر انہوں نے زندگی واپس بنانا شروع کی اور جیسا انہوں نے عہد کیا تھا۔ انہوں نے اپنے استاد کا مجموعہ شائع کروا لیا جو دہلی شہر کے ایک عہد کی یادگار ہے۔ دہلی کی انٹلکچوئل اور آرٹ کی تخلیقی روایات کی یادگار، جنہیں چار سال پہلے تباہ کر دیا گیا تھا۔ آزاد کی اس لگن کی وجہ سے ابراہیم ذوق کا نام اور کام زندہ رہ گیا۔

دہلی سے نکلنے والے پناہ گزینوں کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ انہیں گجر اور میواتی قبائلیوں نے لوٹ مار کا نشانہ بنایا۔ خواجہ حسن نظامی نے ان واقعات پر کتاب ""بیگمات کے آنسو"" لکھی ہے۔

شاہی خاندان کے مرزا شاہ زور اپنی حاملہ بیوی، چھوٹی بہن اور والدہ کے ساتھ نکل کر مہروالی پر قطب صاحب کی درگاہ پر گئے اور ایک رات گزاری۔ اگلی صبح چھترپور سے کچھ میل دور گجروں نے لوٹ لیا۔ قبائلیوں نے سب کچھ چھین لیا لیکن جان بخشی کر دی۔ ""خواتین رو رہی تھیں۔ میں نے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ قریب ہی گاؤں تھا۔ میری والدہ قدم قدم پر گر پڑتیں اور کہتیں کہ قسمت نے اس عمر میں انہیں کیا دن دکھائے ہیں۔ یہ گاؤں مسلمان میواتیوں کا تھا جنہوں نے ہمیں چوپال میں ٹھہرنے دیا۔ گاؤں والوں نے کھلایا پلایا لیکن کچھ دن بعد کہنے لگے کہ کام کاج میں حصہ ڈالیں۔ میں نے کہا کہ میں خوشی خوشی کام کو تیار ہوں۔ میں فوجی خاندان سے ہوں۔ بندوق چلانا جانتا ہوں۔ تلوار بازی کر سکتا ہوں۔ گاؤں والے ہنسنے لگے اور کہا کہ یہاں پر گولی چلانے کی ضرورت نہیں۔ ہل چلانے اور زمین کھودنے کی ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گاؤں والوں نے ترس کھایا اور کہا کہ کھیتوں کی حفاظت کرو اور خواتین سلائی کر دیا کریں اور ہم فصل میں سے حصہ دے دیں گے اور یوں ہماری زندگی سیٹ ہوئی۔ میں سارا دن کھیتوں میں گزارتا۔ پرندے اڑاتا اور خواتین گھر میں کپڑے سیتیں""۔

دو سال دیہات میں رہے اور اس دوران اصل بھوک برداشت کی۔ سیلاب انہیں تقریباً بہا لے گئے۔ ڈاکٹر نہ ہونے کی وجہ سے ان کی بیوی بچے کی پیدائش کے دوران انتقال کر گئیں۔ اس کے بعد انہیں دہلی آنے دیا گیا کہ وہ نئی زندگی گزار سکیں۔ جب برٹش نے شاہی خاندان کے بچ جانے والوں کے لئے پانچ روپے ماہانہ پنشن مقرر کی تھی۔

اسی طرح ظفر سلطان جو بہادر شاہ ظفر کے بھتیجے تھے، انیس ستمبر کو اپنی والدہ کے ساتھ بیل گاڑی پر نکلے۔ پہلی رات ایک گاؤں پر رکے اور سو گئے۔ اگلے روز اٹھے تو پتا لگا کہ بنجارا بیل اور گاڑی لے کر بھاگ گیا ہے۔ انہیں ایک جاٹ گاؤں میں پناہ ملی جہاں انہیں کھانا دیا گیا لیکن جلد ہی جاٹ ان پر ٹوٹ پڑے۔ جاٹوں کو شک تھا (اور صحیح تھا) کہ ان کے پاس قیمتی زیور ہیں۔ ظفر سلطان نے جب سب کچھ دے دیا تو جاٹ انہیں والدہ سمیت جنگل میں پھینک آئے۔ اس دوران والدہ کے سر پر لاٹھی لگی اور وہ شدید زخمی ہو گئیں۔ ""میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کیسی ہیں تو انہوں نے کہا کہ میں ہندوستان کے بادشاہ کی بھابھی ہوں اور میری قسمت دیکھو۔ میں جنگل میں مر رہی ہوں اور دفن کے لئے کفن تک نہیں۔ وہ فوت ہو گئیں۔ میں نے ہمت جمع کر کے اپنی طرف سے جیسی قبر کھود سکتا تھا، کھود کر دفنا دیا""۔

ظفر سلطان فقیر بن گئے۔ ایک شہر سے دوسرے میں پھرا کرتے۔ ممبئی گئے اور پھر مکہ جہاں دس سال تک زائرین کی خیرات سے گزارا کرتے رہے۔ وہاں سے واپس کراچی اور پھر دہلی آ گئے۔ یہاں پر ٹھیلے والے کے طور پر کام کرتے رہے۔ ٹھیلے میں اینٹیں ڈھوتے جو ریلوے سٹیشن کی تعمیر کے لئے استعمال ہو رہی تھیں۔ مزدوری سے اتنے پیسے بچا لئے کہ اپنا ٹھیلہ خرید لیا۔ انہیں سرکاری پنشن کی آفر ہوئی لیکن اس سے انکار کر دیا کہ ""محنت کی روزی مانگے کی روزی سے بہتر ہے""۔

جب خواجہ حسن نظامی کی 1917 میں مرزا ظفر سلطان سے ملاقات ہوئی تو وہ بوڑھے تھے اور اونچا سنتے تھے۔ ان کا پتا اس وقت لگا تھا جب انہیں ایک تاجر سے لڑائی کے بعد عدالت لے جایا گیا تھا جس کے ٹانگے کی ان کے ٹھیلے سے ہونے والی ٹکر ہونے کے بعد امیر تاجر نے اپنا چابک نکال کر انہیں مارنا شروع کر دیا۔ ابتدائی ضربوں کے بعد وہ خاموش رہے لیکن پھر ہمت جمع کر کے ایک زوردار گھونسا مار کر تاجر کی ناک توڑ دی تھی۔ عدالت میں انہوں نے بتایا کہ ""امیر شخص غریب کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ ساٹھ سال پہلے اس کے آباء ہمارے خادم ہوں گے۔ اور صرف اس کے نہیں، پورا ہندوستان میرے حکم کی تعمیل کرتا تھا۔ میں اپنے خاندان کو نہیں بھولا۔ ایسی ہتک کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ دیکھیں کہ ایک ہاتھ کھانے کے بعد کیسے بھاگ گیا تھا۔ تیموریوں کا ایک تھپڑ برداشت کرنا آسان نہیں ہے""۔

اور جو لوگ دلی سے نہیں نکلے، محل پر قبضہ ہو جانے کے بعد ان کے ساتھ زیادہ برا ہوا۔ شہر کے گھروں میں وہ لوگ جو زخمی تھے یا بیمار کہ وہ چل نہیں سکتے تھے۔ ان کی مشکل تلوار سے آسان کی گئی۔ گھروں سے اسلحہ، کپڑے، بستر، ڈھول اور موسیقی کا سامان ۔۔۔ سب کچھ لوٹ لیا گیا۔

علاقے کو ہر قسم کے فسادیوں سے صاف کرنے کا حکم فوج کو ملا۔ وبارٹ جو فوج کا حصہ تھے، لکھتے ہیں، ""وہ میری زندگی کا بدترین دن تھا۔ ہم دہلی اور ترکمان گیٹ کے قریب کے گھروں کو کلئیر کر رہے تھے۔ ایک گھر میں میرے سامنے تیس سے چالیس لوگوں کو مارا گیا۔ یہ قتل کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ خواتین کو چھوڑ دیا گیا لیکن اپنے شوہروں اور بیٹوں کو اپنے سامنے ذبح ہوتے دیکھ کر ان کی چیخیں سننا ناقابل برداشت تھا۔ آپ شہر کی سڑکوں پر گلتی سڑتی لاشیں اور بازاروں میں شراب کے نشے میں دھت فوجی دیکھ سکتے تھے۔

میں رحمدل شخص نہیں لیکن جب آپ کے سامنے ادھیڑ عمر شخص لایا جاتا ہے جو گر کر زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو تو اسے مارتے وقت ہاتھ رک جاتا ہے۔ لیکن پھر آپ کو اپنے آپ کو یاد کروانا پڑتا ہے کہ یہ سب نیک مقصد کے لئے ہے۔ اس کا خون وہ داغ دھوئے گا جو اس کے لوگوں نے ہمارے ساتھ کئے۔ میرے والد اور والدہ کو مارا گیا تھا، بھائی اور بہن کو

بھی۔ وہ انصاف کے لئے پکار رہے تھے۔ خدا نے طاقت اور ہمت دی اور ہم نے فرض پورا کر دیا لیکن خدا ایسا دن پھر کبھی نہ دکھائے''۔

سب سے برا قتلِ عام کوچہ چیلاں میں ہوا جہاں کے 1400 دہلی والوں کو مارا گیا۔ یہاں پر نواب محمد علی خان نے لوٹ مار کے خلاف مزاحمت کی تھی اور تین برٹش فوجیوں کو مار دیا تھا جو ان کی حویلی میں گھس آئے تھے اور زنانے میں چلے گئے تھے۔ ان برٹش فوجیوں کے ساتھی ایک عدد توپ یہاں لے آئے اور اس پوری حویلی کو اڑا دیا گیا۔

اس کے بعد محلے میں رہنے والے ہر شخص کا قتل ہوا۔ یہ سنگینیں گھونپ کر کیا گیا۔ چالیس افراد کو جمنا لایا گیا۔ قلعے کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے گولیاں مار دی گئیں۔ کوچہ چیلاں دہلی کے دانشوروں کا محلہ تھا۔ سب سے قابل شاعر اور فنکار یہاں رہتے تھے۔ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں، '' یہ کوچہ دہلی کا فخر تھا۔ اس جیسا دنیا میں کہیں اور نہ ہو گا اور نہ کبھی آئے گا۔ اس میں میاں امیر پنجہ کش تھے جن کے مقابلے کا خطاط دنیا بھر میں نہ ہو گا۔ ہمارے بہترین شاعر مولوی امام بخش صہبائی اور ان کے دو بیٹے۔ میر نیاز علی جو دہلی کے مشہور قصہ گو تھے۔ ان چودہ سو لوگوں میں تھے۔ اسکے بعد ان سب کی لاشوں کو دریا میں پھینک دیا گیا۔ گھر کے مردوں کے قتل ہو جانے کے بعد کئی خواتین نے بچوں سمیت کنویں میں کود کر خودکشی کر لی۔ کئی مہینوں تک محلے کے کنویں لاشوں سے بھرے رہے۔ اور میرا قلم اس سے آگے لکھنے سے انکاری ہے''۔

قادر علی نے دہلی کے مورخ راشد الخیری کو بتایا۔

''دہلی میں قیامت کا سماں تھا۔ ہمیں دریا کنارے لے جایا گیا۔ فوجیوں بندوقیں تان رہے تھے۔ اس وقت برٹش فوج کا ایک مسلمان افسر ہمارے پاس آیا اور کہا کہ موت تو تمہارے سامنے ہے۔ بندوق آگے، دریا پیچھے۔ جو تیرنا جانتے ہیں چھلانگ لگا دیں اور فرار ہو جائیں۔ میں اچھا تیراک تھا لیکن ماموں صاحب (صہبائی) اور ان کے بیٹے مولانا سوز نے یہ فن نہیں سیکھا تھا۔ میں انہیں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن ماموں صاحب نے اصرار کیا۔ میں نے چھلانگ لگا دی۔ پچاس ساٹھ گز ہی گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آواز آئی اور میں نے گرتے ہوئے لوگوں کی قطار دیکھی''۔

ظہیر دہلوی کے سسر جنہوں نے بغاوت کے دنوں میں تین انگریز خواتین کو پناہ دی تھی اور زندگی بچا کر بھاگنے میں مدد کی تھی، انہیں بھی اسی روز اپنے بیٹے اور دو خادموں سمیت مار دیا گیا۔

دیوانِ خاص میں ضیافت جاری تھی، اس میں شریک میجر ولیم آئیرلینڈ لکھتے ہیں کہ ''سکھ فوجی لوٹ مار میں سب سے ماہر نکلے۔ وہ گھروں میں چھپی جگہوں سے خزانہ ڈھونڈ نکال میں اچھے تھے۔ جنرل ولسن نے کہا تھا کہ مالِ غنیمت کی تقسیم منصفانہ ہو گی لیکن بہت سے سکھ فوجی اتنا لوٹ چکے تھے کہ وہ ان کے تمام خاندان کو امیر کر سکتا تھا۔ وہ اس کو لے کر نکلنے کے چکر میں تھے۔ شہر کے دروازوں پر گارڈ تعینات تھے لیکن وہ شہر کی دیوار سے خزانہ نیچے کھڑے دوستوں کو پھینک کر باہر لے جا رہے تھے''۔

برٹش فوج نے مارتے وقت کسی میں تمیز نہیں کی کہ کون ان کے حق میں تھا اور کون خلاف لیکن مخبر ان کے کام کے تھے۔ کسی شخص کو پکڑوانے پر دو روپیہ انعام مقرر تھا۔ کسی قیمتی سامان کا پتا دینے کی مخبری اچھا معاوضہ دیتی تھا۔

بیس ستمبر کی رات کو جنرل بخت خان ہمایوں کے مقبرے پر رکے اور بہادر شاہ ظفر کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ وہ ان کے ساتھ لکھنؤ چلیں جہاں سے جدوجہد جاری رکھی جائے۔ لیکن ایک بار پھر حکیم احسن اللہ خان نے مخالفت کی، ''آپ بادشاہ ہیں۔ بغاوت کرنے والے انگریز فوج کے سپاہی تھے جنہوں نے اپنے افسروں سے بغاوت کی تھی، وہ ان سے لڑے اور ہار گئے اور بھاگ گئے۔ عالی جاہ کا ان سے کیا تعلق؟ بہادر بنیں۔ انگریز آپ کو قصور وار نہیں ٹھہرائیں گے''۔

مرزا مغل کو ان کے سسر مرزا الٰہی بخش نے ٹھہرنے کے لئے قائل کر لیا۔

اس رات مرزا الٰہی بخش دہلی آئے اور ہوڈسن کو بتایا کہ بہادر شاہ ظفر اور مرزا مغل کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ یہ انفارمیشن بھی دی کہ ان کے پاس خاندان کے جواہرات ہیں اور جائیداد کی فہرست۔ ہوڈسن نے ولسن سے اجازت مانگی کہ وہ ان کو پکڑنے کے لئے جانا چاہتے ہیں۔ شاہی خاندان کو پکڑے بغیر فتح مکمل نہیں ہو گی۔

اکیس ستمبر کی صبح دہلی میں ہونے والا برطانوی شاہی سلیوٹ اس کا اعلان تھا کہ دہلی اب ایک بار پھر تاجِ برطانیہ تلے ہے۔ لیکن ہندوستان کا ہیرا شہر اب مردہ لاشوں اور نشے میں دھت برٹش فوجیوں کا ویرانہ تھا۔ میجر ولیم آئیرلینڈ جنہوں نے انگریز فوج کے طرزِ عمل کو تنقید کا نشانہ بنایا، لکھتے ہیں۔

''نہ بازار میں کوئی دکاندار تھا، نہ اونٹوں اور بیلوں کی گاڑیاں کھینچ کر لے جانے والا، نہ کوئی راہگیر تھا، نہ لوگ کھڑے خوش گپیاں لگا رہے تھے، نہ بچے مٹی میں کھیل رہے تھے، نہ خواتین کی آوازیں تھیں۔ گھروں کا سامان گلیوں میں الٹا پڑا تھا۔ پالتو جانور اپنے مالکوں کی تلاش میں گلیوں میں پھر رہے تھے۔ توپوں کے گولوں سے گری دیواروں کے منظر تھے۔ سڑتی انسانی لاشوں کو کوے اور گیدڑ کھا رہے تھے۔ کوئی خوشی سے شہر چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ اور کہتے ہیں کہ ہم نے دہلی آزاد کروا لیا تھا''۔

لیفٹیننٹ ایڈورڈ اومانی، جو فارسی اور اردو کے سکالر تھے اور شہر کی تاریخ سے واقف تھے، اس منظر کو دیکھ کر سراسیمہ تھے۔

''اس شہر میں ڈیڑھ لاکھ لوگ بستے تھے۔ اب یہ تقریباً خالی تھا۔ جب نادر شاہ نے اسے تاراج کیا تھا، تب بھی ایسا نہیں ہوا تھا''۔

ہوڈسن مرزا الٰہی بخش اور برٹش کے دہلی میں جاسوسی نیٹورک کے سربراہ مولوی رجب علی اور پچاس پنجابی سواروں کے دستے کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے کی طرف نکلے۔ وہ اپنا نام تاریخ کے کتابوں میں لکھوانا چاہتے تھے۔ سب کچھ طے تھا۔ اب گرفتاری کا وقت تھا۔ وہ اس کو پکڑنے نکلے تھے جس کے بارے میں برٹش کہتے تھے کہ وہ اس بغاوت کے جال کے مرکز میں بیٹھا مکڑا ہے۔

گرفتاری

ہوڈسن بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے ہمایوں کے مقبرے پر پہنچ گئے۔ گرفتار کرنے والی پارٹی میں سے مولوی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش کو بات کرنے اندر بھیجا۔ ان کے ساتھ سکھ رسالدار من سنگھ اور چند محافظ تھے۔ مولوی رجب علی نے یہ مذاکرات کرنے تھے۔ دو گھنٹے بات چیت چلتی رہی اور پھر رسالدار نے آ کر بتایا کہ بادشاہ باہر آ رہے ہیں۔ کچھ تاخیر کے بعد پالکی میں بادشاہ برآمد ہوئے۔ ان کے ساتھ مرزا الٰہی بخش اور مولوی تھے۔ان کے پیچھے بیگم زینت محل اپنے بیٹے اور والد کے ساتھ۔ پالکی رکی اور ہوڈسن کو پیغام دیا گیا کہ بادشاہ خود ہوڈسن کی زبان سے ضمانت چاہتے ہیں۔ ہوڈسن نے وعدہ کیا کہ جیسے طے ہوا ہے، جان بھی بخشی جائے گی اور بے عزتی بھی نہیں کی جائے گی۔

اس کے بعد سب دہلی روانہ ہو گئے۔ دہلی میں چاندنی چوک سے ہوتے ہوئے قلعے میں داخل ہو گئے۔ چند روز پہلے تک اس قلعے میں بادشاہ کے طور پر رہنے والے بہادر شاہ ظفر اب یہاں بادشاہ نہیں، قیدی تھے۔

ہر کوئی رک کر انہیں گھور رہا تھا۔ ایک برٹش سرجن نے اس منظر کو یوں بیان کیا، ”وہ ایک بوڑھا شخص تھا جس کے چہرے پر اداسی تھی جسے اپنے محل کے ملبے سے گزار کر لایا گیا تھا۔ وہ کسی ظالم شخص کا چہرہ نہیں لگتا تھا۔ میری توقع سے بڑا مختلف تھا“۔

ظفر کو زینت محل کی حویلی لے جایا گیا۔ ان کو بدتمیز اور جارحانہ مزاج کو گمل کی تحویل میں دے دیا گیا۔ ”میرا دل خوش ہو گیا کہ ہندوستان کا بادشاہ میرا قیدی تھا۔ میں نے اسے خوب گالیاں دیں۔ سؤر اور دوسرے مناسب القابات سے نوازا۔ پوچھا کہ اس نے ہمارے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ وہ چپ کر کے نظریں نیچی کئے سنتا رہا۔ اگر اس نے آنکھ اٹھائی بھی ہوتی تو میں نے اسے گولی مار دینی تھی۔ اس پر دو سنتری مقرر کئے اور انہیں حکم دیا کہ اگر یہ زیادہ چوں چراں کرے تو بے دریغ اسے شوٹ کر دیں“۔

اگلی صبح ہوڈسن نے تین شہزادوں کو لینے جانا تھا۔ مرزا الہی بخش نے بتایا تھا کہ وہ وہیں پر ہیں۔ ان تینوں نے انقلاب کے دوران مغل فورسز کی قیادت کی تھی۔ جنرل ولسن نے ہوڈسن کو کہا کہ شہزادوں کے ساتھ جو دل چاہے، سلوک کریں۔ صبح آٹھ بجے مولوی رجب اور مرزا الہی بخش کے ساتھ ہوڈسن پھر نکلے۔ ان دونوں کو پھر مذاکرات کے لئے اندر بھیجا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد شہزادوں نے ہوڈسن کو پیغام بھیجا کہ وہ ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار ہیں اگر ان کی جان بخشی کا وعدہ کیا جائے۔ ہوڈسن نے کہا کہ ’’نہیں، کسی بھی چیز کی کوئی گارنٹی نہیں۔ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے ہوں گے‘‘۔ انتظار بڑھتا گیا۔ شہزادے ہتھیار ڈالنے کو تیار نہ تھے۔

یہ جگہ دہلی سے چھ میل دور تھی۔ ہوڈسن کے پاس سو سپاہی تھے۔ اس احاطے میں تین ہزار مسلمان۔ اگر بزور لے جانے کی کوشش کی جاتی تو شاید ہی ہوڈسن بچ پاتے۔ اس لئے وہ امید کر رہے تھے کہ مرزا الہی بخش اور مولوی رجب علی اپنا کمال دکھا سکیں گے اور انہیں قائل کر لیں گے۔ مرزا الہی بخش بہادر شاہ ظفر کے سمدھی اور ان تین شہزادوں میں سے مرزا ابو بکر کے نانا تھے۔ یہ کمال کیسے کیا گیا؟ معلوم نہیں۔ لیکن طویل بات چیت کے بعد شہزادوں نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ شہزادوں کو ایک رتھ پر سوار کیا گیا جس کو بیل کھینچ رہے تھے۔ پانچ فوجی ایک طرف، پانچ دوسری طرف۔ سب دہلی روانہ ہو گئے۔

دہلی کے پاس پہنچے تو لوگوں کا کچھ مجمع تھا۔ ہوڈسن نے یہاں پر رتھ رکوائی۔ تینوں شہزادوں کو رتھ سے اترنے کو کہا اور پھر انہیں جسم کے تمام کپڑے اتارنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد ایک ریوالور نکالا اور اور مرزا مغل کے سینے پر رکھ دیا اور دو فائر کئے۔ یہی باقی دونوں کے ساتھ کیا گیا۔ پھر ان کی لاشوں سے بازوبند اور انگوٹھیاں اتاریں اور ٹرافی کے طور پر اپنے پاس رکھ لیں اور ان کی تلواریں بھی۔ اگلے روز اپنی بہن کو ہوڈسن نے خط لکھا۔

’’یہ ایک تھکا دینے والی مہم تھی لیکن یہ اس کا بہترین اور یادگار وقت تھا۔ میں نے اپنی نسل کے دشمنوں کو مار دیا تھا۔ یہ ہماری قوم کے لئے خوشی کی گھڑی تھی۔ میں ظالم نہیں لیکن یہ تسلیم کرتا ہوں کہ زمین کو ان کمینوں کے بوجھ سے نجات دلوا کر بہت خوشی محسوس ہوئی تھی‘‘۔

شہزادوں کی برہنہ لاشیں کوتوالی کے آگے رکھ دی گئیں جہاں فوجیوں کی ان کو دیکھنے کے لئے قطار لگنے لگی۔ ہوڈسن کو شاباشیں ملنے لگیں۔

ہوڈسن نے جو کیا، اس پر بعد میں انکوائری کی گئی۔ اس پر نہیں کہ شہزادوں کو کیوں مارا۔ اس پر کہ بہادر شاہ ظفر کی زندگی بچنے کی گارنٹی کیوں دی؟

اس دوران متجسس برٹش فوجی قید بادشاہ کو دیکھنے آ رہے تھے جو ملکہ کی حویلی میں بیٹھے تھے۔ ایک افسر کے مطابق ’’جیسے پنجرے میں درندہ بند ہو‘‘۔ ایک افسر نے گھر خط میں لکھا، ’’ہم بادشاہ کو مجبور کرتے کہ کھڑے ہو کر ہمیں سلام کرے‘‘۔

جب بہادر شاہ ظفر کو تین شہزادوں کے ہلاک ہونے کی خبر دی گئی تو انہوں نے کوئی تاثر نہیں دیا۔

اس دوران دلی میں فوجی عدالتیں بن گئیں۔ شہر میں پھانسیاں نصب ہونے لگیں۔ اب شہر میں انصاف کئے جانے کی باری تھی۔

لاشوں کا شہر

دلی میں فوجی عدالتوں نے کام شروع کر دیا۔ انصاف کی باری تھی۔ پھانسیاں نصب ہو گئیں۔ لوگ لٹکنے لگے۔ سب سے بڑا مرکز چاندنی چوک میں بنا۔ عوام تماشا دیکھنے اکٹھے ہوتے۔ سیٹیاں بجاتے، تالیاں بجائی جاتیں، نعرے لگتے۔ ویسے ہی جیسے انقلابِ فرانس میں ہوا تھا، یہ سزائیں تفریح کا مرکز تھیں۔ تماش بینوں کے لطف کے لئے پھانسی کی رسی چھوٹی کر دی گئی۔ لمبی رسی کے برعکس اس طرح جان دیر سے نکلتی تھی۔

دہلی کی رپورٹیں گورنر جنرل کیننگ کو پہنچیں تو وہ خوش نہیں تھے۔ 25 ستمبر کو انہوں نے ملکہ وکٹوریا کو اس بارے میں تفصیل سے خط لکھا کہ دہلی میں بڑے پیمانے پر انتقام لیا گیا ہے اور شرمناک مثالیں قائم ہو رہی ہیں۔

بغاوت کے مقدمات ملٹری کمیشن سنتا۔ موت کے سوا کچھ اور سزا نہیں تھی۔ اس کی وجہ صرف انتقام نہیں تھی۔ مقامی مخبر جنہیں ایک بندہ پکڑوانے پر دو روپے ملتے تھے اور گرفتار کرنے والوں کو پکڑے جانے والے کی دولت ۔۔۔ اس میں پیسہ کمانے کو بھی تھا۔

ستائیس ستمبر کو دیوانِ خاص میں دہلی کی فتح کے شکرانے کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس کے بعد برٹش فیلڈ فورس کے لئے اگلی معرکوں کی تیاری تھی۔ فریڈ رابرٹس کے مطابق ""ہم بدبودار لاشوں کا شہر چھوڑ کر جا رہے تھے""۔ بہت سے فوجیوں کا اگلا ہدف لکھنؤ تھا۔

بہادر شاہ ظفر کا اگلا جیلر ایڈورڈ اومانی کو بنایا گیا۔ انہیں مرزا نیلی کے گھر منتقل کر دیا گیا۔ ایک چارپائی، ایک کمرہ اور ایک حقہ ملا اور سفید کاٹن کا سوٹ۔ دھوبی، نائی یا حکیم تک رسائی نہیں تھی۔

ایک تحریک شروع ہوئی تھی کہ دہلی کو نقشے سے مٹا دیا جائے۔ اس نام کا شہر ہی نہ رہنے پائے۔ تمام عمارتیں گرا دی جائیں۔ چارلس ریکس نے کہا کہ ""جامعہ مسجد کو چرچ بنا دیا جائے۔ اس جنگ کے شہدا کے ناموں پر اس کے پتھروں کا نام رکھا جائے""۔ کوپ لینڈ نے آرٹیکل لکھا، ""اس شہر کو اگر منہدم نہ کیا گیا، اس کی خون آشام دیواروں اور سڑکوں کو کھڑا رہنے دیا گیا تو یہ برطانیہ کے وقار پر ہمیشہ رہ جانے والے بدنما داغ ہو گا""۔

ان آوازوں کے مخالف برطانوی پارلیمنٹیرین ہنری لایارڈ کی اونچی آواز بہادر شاہ ظفر کی حمایت میں تھی۔

""ہم جو کر رہے ہیں وہ کسی عظیم قوم کے شایانِ شان نہیں۔ میں نے ایک بوڑھے اور شکستہ آدمی کو دیکھا جو چادر پر لیٹا تھا۔ اس کے پاس خود کو ڈھانپنے کے لئے چادر نہیں تھی۔ اسے اٹھنے میں دقت تھی۔ میں نے اس کے بازو دیکھے جو زخمی تھے اور مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اسے پیاس لگی تھی اور پانی میسر نہیں تھا۔ اسے ٹھیک سے کھانے کو نہیں ملا تھا۔ کیا یہ طریقہ کرسچن طریقہ ہے؟ ہم جس مذہب کے پیروکار ہیں، وہ ہمیں کیا سکھاتا ہے؟ میں نے اس کی خواتین کو بھی دیکھا جو برے حال میں تھیں۔ ان کے لئے کل مختص بجٹ دو آنے روزانہ ہے۔ کیا ایک بادشاہ کے لئے یہی سزا کافی نہیں؟""۔

لیکن بہادر شاہ کی حالت اگر بری تھی تو دہلی کے عام لوگوں کی حالت بہت بدتر تھی۔ زیادہ تر لوگ شہر کے باہر دیہی علاقوں میں قیام پذیر تھے۔ کسی قبرستان میں، کسی کھنڈر میں۔ جنگلی پھلوں پر یا مانگ تانگ کر گزارا کر رہے تھے۔ اور جو چند شہر کے اندر بچے تھے، وہ فاقہ زدگی کا شکار تھے۔

جو برٹش کے وفادار ملازم تھے اور انہوں نے اپنی حویلیوں میں رہنا پسند کیا تھا، ان کے لئے بھی زندگی گزارنا ناممکن ہو رہا تھا۔ سرکاری اور غیر سرکاری لٹیرے گھروں سے قیمتی سامان کی تلاش میں تھے۔ فوجی اس کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ فوجی قانون کے مطابق شہر سے لوٹا گیا مالِ غنیمت فتح کرنے والے کا حق تھا۔ (یہ جینیوا معاہدے سے پہلے کی دنیا تھی)۔

جو لوگ دعویٰ کر رہے تھے کہ وہ برٹش جاسوس رہے ہیں، ان کے بارے میں جنرل ولسن نے آرڈر جاری کیا تھا کہ جب تک ان کے دستخط سے جاری کردہ ٹکٹ کسی کے پاس نہ ہو، اسے برٹش حمایتی نہیں سمجھا جائے۔ منشی جیون لال دلی کے اندر جاسوسی نیٹورک کے بہت اہم جاسوس تھے اور دلی کے محاصرے کے دوران برٹش فوج کے لئے بھیجے جانے والے جاسوسی کے رقعے انہی کے گھر لکھے جاتے تھے۔ ان کے گھر کا سکھ فوجیوں نے 21 ستمبر کو صفایا کر دیا۔ اور یہاں تک کہ انگریزوں کے سب سے بڑے مددگار مرزا الٰہی بخش، جنہوں نے انگریزوں کی وفاداری میں نہ صرف اپنے کزن بہادر شاہ کو گرفتار کروایا بلکہ خود اپنے نواسے مرزا ابو بکر کو مروایا تھا، کا گھر بھی لوٹ کر سب کچھ مال غنیمت میں جمع کروا دیا گیا۔

(مرزا الٰہی بخش کا کردار اس قدر حیران کن تھا کہ خود انگریزوں نے انہیں ''دہلی کا غدار'' کہا ہے)۔

دلی میں بچ جانے والوں میں سے ایک مرزا غالب تھے۔ قسمت نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ ان کے محلے میں پٹیالہ کے مہاراجہ کے سینئیر درباریوں کی رہائش تھی۔ پٹیالہ کے مہاراجہ نے اپنی افواج برٹش کو دی تھیں، برٹش افواج کو سامان پہنچاتے رہے تھے۔ اس وجہ سے یہ محلہ محفوظ رہا تھا۔ یہاں گارڈ تعینات تھے۔ غالب شاید مغل دربار سے منسلک وہ واحد شخص تھے جن کی جائیداد نہیں چھینی گئی۔ لیکن ان کے لئے بھی یہ برا وقت تھا۔ وہ اپنی کتاب داستائی بوئی میں لکھتے ہیں کہ کیسے ان کے محلہ داروں نے محلے کا گیٹ بند کر کے پتھروں کی دیوار بنا دی تھی اور گرفتاریوں اور قتل و غارت سے بچ گئے تھے جن سے ان کے دوست نہ بچ پائے۔ لیکن محلے والوں کی پریشانی خوراک اور پانی تھے کہ وہ کب تک بچ پائیں گے۔ غالب لکھتے ہیں۔

''نہ کوئی دکاندار تھا، نہ خریدار۔ نہ کسی سے گندم خریدی جا سکتی تھی۔ نہ دھوبی تھا جو کپڑے دھو دیتا۔ نہ کوئی نائی جو بال بنا دیتا۔ نہ کوئی صفائی والا جو فرش صاف کر دیتا۔ نہ آٹا اور پانی لینے جایا جا سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ، گھر کا سارا سامان ختم ہو گیا۔ ہم نے بڑی احتیاط کی تھی کہ پانی کی ایک بوند بھی ضائع نہ ہو لیکن یہ بھی ختم ہو گیا۔ ہم کئی دنوں سے بھوکے تھے۔ باہر قتلِ عام جاری تھا۔ ہم قدم نہیں نکال سکتے تھے۔ پھر ایک روز بادل آئے اور بارش خوب برسی ہم نے پانی اکٹھا کر لیا۔ وہ بچے جنہیں میں نے لاڈ پیار سے پالا تھا، دودھ، پھل اور مٹھائی کی فرمائش کرتے تھے اور میں پوری نہیں کر سکتا تھا''۔

غالب کے بھائی کو برٹش فوجیوں نے گولی مار دی تھی۔ ان کو غسل دینے کو پانی نہیں تھا اور نہ ہی کفن کرنے کو۔ بالآخر پانچ اکتوبر کو برٹش فوجی محلے میں گھس آئے اور غالب کو پکڑ کر کرنل برن کے پاس لے گئے۔

کرنل نے غالب سے پوچھا، ''مسلمان ہو؟'' غالب نے کہا، ''نصف''۔ کرنل: ''کیا مطلب؟''۔ غالب: ''شراب پی لیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا''۔ غالب نے اس کے بعد کرنل کو خط دکھایا جس میں انہوں نے ملکہ وکٹوریا کی شان میں قصیدہ لکھا تھا اور منسٹری کی طرف سے اس کی وصولی کی تصدیق ہوئی تھی۔ کرنل نے پوچھا کہ ''حکومت کی فتح کے بعد حاضری دینے کیوں نہیں آئے؟'' تو غالب نے کہا کہ ''چار کہار میری پالکی اٹھاتے ہیں، وہ چاروں بھاگ گئے اور مجھے اکیلا چھوڑ

گئے۔ اس کے بعد غالب نے کہا کہ ''میں بوڑھا، معذور اور بہرا ہوں۔ اس لئے لڑ نہیں سکتا۔ آپ کی کامیابی کے لئے دعا کر سکتا تھا اور وہ کرتا رہا ہوں اور یہ کام گھر بیٹھے بھی ہو سکتا تھا، اس لئے آپ کے پاس نہیں آیا''۔

اس ملاقات کے بعد کرنل برن نے غالب کو جانے دیا اور پھانسی کا پھندا ان کے گلے میں نہ پڑا۔

غالب کے اندازے کے مطابق شہر میں ایک ہزار مسلمان بچے تھے اور ان کے سارے دوست بھی اور رقیب بھی مارے گئے تھے۔ وہ اپنی یادیں یا اشعار کسی سے شئیر نہیں کر سکتے تھے۔ ایک خط میں انہوں نے لکھا۔

''ہندستان سے روشنی چلی گئی ہے۔ شمعیں بجھ گئی ہیں۔ لاکھوں مارے گئے اور لاکھوں قید میں ہیں۔ لوگ غم کی شدت سے پاگل ہو جاتے ہیں۔ میں نے کیا غم نہیں دیکھے۔ موت کا غم، جدائی کا غم، آمدنی ختم ہو جانے کا غم، عزت چھن جانے کا غم۔ میرے دوست مارے گئے۔ میں انہیں کیسے بھلا سکتا ہوں؟ انہیں کیسے واپس لایا جا سکتا ہے؟ رشتہ دار، دوست، شاگرد، محبوب۔ ایک شخص کا سوگ منانا کس قدر مشکل ہے۔ میرے پاس تو بے شمار ہیں جن کا غم ہے۔ خدا کی قسم، اگر آج میں مر جاؤں تو کوئی ایک ذی روح نہیں بچا جو میرے جانے کا غم کرے''۔

جو لوگ دہلی سے باہر تھے، ان کے حالات زیادہ برے تھے۔ سب سے برے انکے جن کا شاہی دربار سے کسی بھی طرح کا تعلق رہا تھا۔ پکڑے جانے پر ان کی سزا موت تھی۔ ظہیر دہلوی کو اس کا پتا تھا اور وہ حرکت میں رہے کہ پکڑے نہ جائیں۔ ایک رات مہروالی کی درگاہ پر اور پھر جھاجر پہنچ گئے جہاں کئی روز بعد پہلی بار باقاعدہ کھانے کو ملا۔ ایک ہفتہ وہاں گزارا تو پتا لگا کہ برٹش وہاں پہنچ گئے ہیں اور دہلی سے آنے والوں کی گرفتاریاں ہو رہی ہیں۔ جان بچا کر پانی پت کی طرف پیدل نکلے۔ یہاں باقی فیملی سے ملاقات ہو گئی۔ انگریزوں نے کچھ روز بعد اس شہر کا محاصرہ کر کے گھر گھر تلاشی شروع کر دی۔ انقلابی اور مغلوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ان کو مطلوب تھے۔ ظہیر بال بال بچے۔ جب انگریز ان کے گھر آئے تو وہ باہر نکلے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے چچا، بھائی اور بہنوئی پکڑے گئے اور دہلی لے جائے گئے جہاں ان کو لٹکا دیا گیا۔ ظہیر رات کو جنگ باز خان کے ہمراہ فرار ہوئے۔ بچتے بچاتے گنگا پار کر کے بریلی پہنچے۔ وہاں برٹش جاسوسوں نے انہیں دھر لیا۔ ان کی جان اس وقت بچی جب میر فتح علی نے انہیں بزورِ تلوار چھڑوا لیا۔

اس کے بعد رامپور گئے جہاں سے پکڑے جانے والے تھے۔ وہاں سے جے پور گئے اور پھر حیدرآباد، جہاں نئی زندگی شروع کی۔ اور یہ وہ جگہ تھی جہاں پر انہوں نے مغل دہلی کی کہانی لکھی جب وہ ستر برس کے تھے۔ ظہیر دہلوی نے واپس کبھی دہلی نہیں دیکھا، ان کی وفات جلاوطنی میں 1911 میں ہوئی۔

اکتوبر اور نومبر میں سرچ پارٹیاں شاہی خاندان کی افراد پر لگی رہیں۔ بہت کم کوئی بچ سکا۔ اس کامیابی کی بڑی وجہ انعام کا لالچ تھا۔ سب سے پہلے بہادر شاہ کے چھوٹے بیٹے اٹھارہ سالہ مرزا بختاور شاہ اور سترہ سالہ مرزا مینڈو پکڑے گئے۔ انہیں میرٹھ کے باغیوں کا ساتھ دینے پر میجر ہیرئیٹ نے مقدمہ چلانے کے بعد سزا سنا دی۔ اومانی ڈائری میں لکھتے ہیں۔

''بارہ اکتوبر کو میں ان کے ساتھ تھا۔ انہیں جیسے کوئی پرواہ نہ ہو۔ صرف بیوی بچوں کو دیکھنے کی خواہش کی۔ میں مرزا مینڈو کے بیوی بچے کو ان سے ملانے لے گیا تا کہ وہ اپنے والد اور شوہر سے چند منٹ کی ملاقات کر لیں۔ اگلے روز انہیں چھکڑے پر بٹھا کر میدان لایا گیا جہاں پر قیدیوں کی آنکھ پر پٹی باندھ دی گئی۔ بارہ رائفل مین کو بارہ قدم دور کھڑا کر دیا

گیا۔ گورکھا فائرنگ سکواڈ نے جان بوجھ کر فائر نیچے کیا تا کہ وہ سست اور تکلیف دہ طریقے سے مریں۔ وہاں پر افسر کو اپنا پستول نکال کر انہیں ختم کرنا پڑا۔ یہ گندے لوگ تھے لیکن انہوں نے بڑے حوصلے سے اپنی سزا برداشت کی تھی''۔

بہادر شاہ کے زیادہ تر بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ جلد یا بدیر یہی ہوا۔ ہمیں صرف دو کا پتا ہے جو نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ اس بارے میں پالیسی نہیں تھی کہ شاہی خاندان کے ساتھ کرنا کیا ہے۔ کیونکہ ان میں بہت سے ایسے تھے جن کا انقلاب سے تعلق نہیں تھا۔ اور سوائے اپنے خاندان کے، ان کے پکڑے جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ کچھ کو سزائے موت ہوئی، کچھ کو کالا پانی بھیج دیا گیا۔ کچھ کو آگرہ، کانپور اور الہ آباد کی جیلوں میں۔ سخت حالات کی وجہ سے زیادہ تر کا پہلے دو برس میں ہی انتقال ہو گیا۔ کچھ کو برما یا کراچی کی جلاوطنی ملی۔ تھوڑی تعداد میں جو بچے وہ کراچی اور برما میں تھے۔ دہلی میں کسی کو بھی نہیں آنے دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ شاہی محل کے پانچ ایسے افراد تھے جو کراچی سے بعد میں فرار ہو کر دہلی پہنچے اور روپوشی کی زندگی گزاری۔

صرف مغل زیرِعتاب نہیں آئے، وہ لیڈر جو غیر جانبدار رہے تھے، وہ بھی قصوروار قرار دئے گئے۔ نواب اور راجے لائے گئے، قید میں گئے، مقدمات چلے اور پھانسی پر لٹکا دئے گئے۔

غالب کے دوست نواب مظفر الدولہ کو الوار سے گرفتار کر کے گڑگاؤں میں پھانسی ملی۔ دہلی کی شیعہ برادری کے لیڈر نواب حامد علی خان جو دہلی چھوڑ گئے تھے انہیں کمال کے پاس پکڑا گیا۔ بلب گڑھ کے راجا کے ایجنٹ حکیم عبدالحق، نواب محمد خان کو اکٹھے پچیس نومبر کو سزائے موت ملی۔ فرخ نگر کے نواب کو ان کے بعد۔

جھاجر کے نواب کو پکڑنے تھیو میٹکاف خود گئے۔ اگرچہ وہ غیر جانبدار رہے تھے لیکن انہوں نے میٹکاف کو انقلاب کے پہلے ہفتے پناہ نہیں دی تھی۔ اومانی نواب کی بہادری سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ جب انہیں سزائے موت دی گئ تو نواب کے دو بیٹے باپ کو دیکھ کر بہت روئے۔ جب انہیں سزا کے لئے لے جایا جا رہا تھا تو ان کے خادموں نے جاتے وقت نواب کو فرشی سلام کئے۔

نواب نے جس طریقے سے عدالت میں دلائل دئے تھے، اس نے کئی لوگوں کو متاثر کیا تھا۔ مسز میوٹر، جو ان سے متاثر ہوئیں، انہوں نے اس پر لکھا ہے، نواب نے کہا۔ ''ہاں، بغاوت کرنے والے بدمعاش لوگ تھے لیکن انہیں ہتھیار کس نے دئے تھے؟ انہیں ٹریننگ دینے والا کون تھا؟ جنہوں نے ہتھیار دئے اور تربیت کی، کیا وہ قصوروار ہیں؟ اور اگر وہ خود اپنے ملازمین کی وفاداری نہیں قائم رکھ سکے تو کیا وہ نااہل ہیں؟ اور وہی قصوروار اور نااہل لوگ مجھے اس عدالت میں کھڑا کر کے مجھے انصاف دیں گے؟''۔

تھیو میٹکاف نے جلد ہی ثابت کیا کہ وہ انسانوں کا شکار کتنے پرجوش طریقے سے کرتے ہیں۔ ڈھونڈ کر لانا اور پھانسی پر چڑھا دینا ان کا شوق بن گیا۔ ان کا یہ جذبہ بڑھتا گیا۔ ایک پھانسی کا پھندا انہوں نے اپنے گھر میں ہی لگا لیا تھا۔ اس سب پر برٹش بھی سوال اٹھانے لگے۔ خاص طور پر ایک کیس نے توجہ حاصل کی۔ ایک گاؤں والوں پر الزام تھا کہ انہوں نے تھیو کے ایک ملازم کو انقلابیوں کے حوالے کیا تھا۔ اس کے جواب میں تھیو نے گاؤں کے اکیس معززین کو سزائے موت دے دی۔

دیلی کے قرب و جوار میں تھیو کی دہشت تھی۔ کسی پر شک بھی ہوتا تو بغیر سوال جواب کئے گولی سے اڑا دیتے۔ تھیو کے جنون کی یہ باتیں لاہور کے جان لارنس تک پہنچیں۔ ان کا کرنل سینڈرز کو لکھا ہوا خط محفوظ ہے۔

''میں تھیو کے بارے میں جو سن رہا ہوں، وہ اگر ٹھیک ہے تو ہمیں کچھ کرنا ہو گا۔ اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔''
اگلا خط اس سے زیادہ سخت الفاظ میں تھا۔

شکل 21: کشمیری دروازے کی 1860 میں لی گئی تصویر۔ اس میں جنگ سے ہونے والا نقصان واضح ہے۔

صرف مغل بادشاہت ہی نہیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کا وقت بھی پورا ہو رہا تھا۔ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا ملک چلانے کا تجربہ اپنے انجام کو بڑھ رہا تھا لیکن کمپنی بہادر کی قسمت سے پہلے ابھی بہادر شاہ ظفر کی قسمت کا فیصلہ کئے جانا تھا۔

مقدمہ

جنوری 1858 تک دربار کے تمام معززین مقدمات کے بعد لٹکائے جا چکے تھے۔ اب بہادر شاہ ظفر کی قسمت طے کئے جانے کی باری تھی۔ لکھنو میں جنگ ابھی چل رہی تھی۔ ماہرینِ قوانین اور مترجمین نے دہلی پہنچنا شروع کر دیا۔ کیا احکامات جاری ہوئے تھے؟ کس نے کئے تھے؟ بادشاہ کا کیا ہاتھ تھا؟ ہوڈسن کی دی ہوئی زندگی کی گارنٹی کی قانونی حیثیت کیا ہے؟ کیا لارڈ کیننگ سے منظوری کے بغیر ہوڈسن ایسا کرنے کے مجاز تھے؟ یہ طے ہو گیا کہ ان پر ''بغاوت، غداری اور قتل'' کے مقدمات چلائے جائیں گے۔ میجر ہیریئیٹ وکیلِ استغاثہ تھے۔

ایک اور بڑا سوال یہ تھا کہ مقدمے کی قانونی حیثیت کیا ہے اور کمپنی یہ کیسے کر سکتی ہے۔ کمپنی نے یہ پوزیشن لی تھی کہ بہادر شاہ کمپنی سے پنشن وصول کرتے تھے اس لئے کمپنی کے پنشنر کے طور پر کمپنی کے ملازم تھے۔ یہ کمپنی کا اپنے ملازم پر لگایا گیا چارج تھا۔ اصل قانونی پوزیشن زیادہ پیچیدہ تھی۔ کمپنی کا چارٹر تجارت کا تھا اور انڈیا میں اس کی کارروائیاں مغل بادشاہ کی اجازت سے تھیں۔ پلاسی کی جنگ کے بعد کمپنی کو مغلوں کی طرف سے بنگال سے ٹیکس اکٹھا کرنے کا ٹھیکہ ملا تھا۔ 1832 تک کمپنی خود کو مغل بادشاہ کا باجگزار تسلیم کرتی تھی۔ اس کے جاری کردہ سکوں پر ''فدوی شاہ عالم'' لکھا ہوتا تھا۔ اگرچہ یہ ہٹا دیا گیا تھا لیکن قانونا اس تعلق میں تبدیلی کے لئے کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ کمپنی نے بادشاہ کو یکطرفہ طور پر نذر دینا بند کر دی تھی۔ لیکن کسی مغل بادشاہ نے کبھی یہ تسلیم نہیں کیا تھا کہ کمپنی ان کے زیرِ نگیں نہیں۔ اس نقطہ نظر سے بہادر شاہ پر شکست کھانے والے دشمن بادشاہ کی حیثیت سے مقدمہ چلایا جا سکتا تھا لیکن رعایا کے طور پر نہیں۔ اور اگر رعایا نہیں تھے تو بغاوت اور غداری کے الزامات ویسے ہی غیر متعلقہ ہو جاتے تھے۔ قانونی طور پر یہ اچھا کیس بنایا جا سکتا تھا کہ دراصل بغاوت کمپنی نے کی تھی جو اپنے فیوڈل آقا سے حکم عدولی کا جرم تھا جس سے کمپنی نے وفاداری کا حلف اٹھایا تھا۔

اس مقدمے کے بے تکا ہونے پر ٹائمز کے صحافی ولیم رسل (جو جنگ کی صحافت کے بانی سمجھے جاتے ہیں) نے لکھا ہے۔ رسل نے جب لال قلعہ دیکھا تھا تو کہا تھا کہ اس میں اور ملکہ وکٹوریا کے ونڈسر قلعے کی شان و شوکت میں فرق نہیں۔ اور جب وہ اس کے مکین سے اس حالت میں ملے جب وہ کمپنی کے قیدی تھے اور انہیں بغاوت کا ماسٹر مائینڈ کہا گیا تھا تو ان کا تاثر تھا، ''ان کی آنکھیں دھندلی اور آوارہ پھرتی تھیں، ان کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ جیسے وہ اپنی حالت سے بے خبر ہوں۔ بڑھاپا جھلک رہا تھا۔ کسی نے انہیں اپنے شعر پڑھتے سنا تھا اور جلی لکڑی سے دیوار پر لکھنے کی کوشش کرتے دیکھا تھا۔ ان کا محل وہ جگہ تھی جہاں سے کچھ تاجروں کو انڈیا میں کام کرنے کا اجازت نامہ تھمایا گیا تھا۔ اور اب ہم ان پر شکر گزار نہ ہونے کا الزام لگا رہے تھے''۔

رسل نے نتیجہ نکالا تھا کہ اگر مقدمہ چلایا ہی جانا ہے تو ملٹری کمیشن میں نہیں، باقاعدہ عدالت میں چلایا جائے۔ جو الزامات لگائے گئے تھے، ان کا ثابت ہونا ناممکن تھا۔ فوجی عدالتوں میں تو کچھ بھی ثابت ہو جایا کرتا ہے لیکن برطانوی عدالت میں دہلی کے بادشاہ پر غداری کا الزام ثابت کرنا ناممکن ہوتا۔

مقدمہ 27 جنوری 1858 کو شروع ہوا۔ بہادر شاہ اس وقت بہت علیل تھے۔ انہیں دیوانِ خاص پالکی میں لایا گیا۔ ایک طرف ان کا بیٹا مرزا جوان بخت اور دوسری طرف ایک خادم۔ انہوں نے سہارا دے کر انہیں بٹھایا۔

پانچ جج تھے جو سب آرمی افسر تھے اور زیادہ سینئیر نہیں تھے اور کوئی اچھی ہندوستانی زبان نہیں جانتا تھا۔ الزامات پڑھ کر سنائے گئے۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ خود کو قصوروار تسلیم کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں پتا لگ گیا کہ بہادر شاہ کو پتا ہی نہیں کہ ہو کیا رہا ہے۔ خاصی تاخیر کے بعد انہیں قائل کیا گیا کہ وہ بتائیں کہ وہ قصوروار نہیں اور مقدمہ آگے چل سکے۔

اگلے دنوں میں ثبوت اور گواہ پیش ہوئے۔ محل سے حاصل کردہ دستاویزات پڑھ کر سنائی گئیں۔ بہادر شاہ کے وکیل غلام عباس نے ان کا مطالعہ کیا۔ بادشاہ نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ انہیں ان کا کچھ نہیں پتا۔ پھر بادشاہ کی توجہ بھٹکنے لگی اور وہ اونگھنے لگے۔ انہیں اس سب میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

کئی بار بادشاہ عدالت میں آنے سے انکار کر دیتے اور خرابی صحت کے باعث کارروائی ملتوی کر دی جاتی۔ جب آتے تو کارروائی پر کوئی توجہ نہ دیتے۔ بہت سے الزامات کے بعد انہوں نے اردو میں ایک بار تفصیلی جواب دیا جو اس کی عکاسی کرتا ہے کہ اگرچہ وہ اس کارروائی سے لاتعلق تھے لیکن ذہنی طور پر چست تھے۔ ''بغاوت کے دن سے پہلے مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ میں نے انہیں بارہا کہا کہ وہ چلے جائیں۔ میرا گواہ تو خدا ہی ہے کہ میں نے نہ ہی فریزر کو اور نہ ہی کسی اور یورپی کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ جہاں تک میری مہر کے ساتھ جاری کردہ احکامات کا تعلق ہے تو جب سے سپاہی آئے تھے، وہ کر رہے تھے جو ان کی مرضی تھی۔ مجھ سے خالی لفافوں پر مہر لگوا لیا کرتے تھے۔ مجھے نہیں پتا کہ اس کے اندر کیا کاغذ تھے اور کس کو بھیجے جا رہے تھے۔ وہ میرے ملازمین پر انگریزوں سے سازباز کا الزام لگاتے تھے اور مجھے ہٹا کر مرزا مغل کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ میرے پاس اختیار ہی کیا تھا؟ وہ یہاں تک چلے گئے تھے کہ انہوں نے ملکہ زینت محل کو ان کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ وہ اسے قید کرنا چاہتے تھے کہ وہ انگریزوں سے ملی ہوئی ہے۔ جو ہوا، وہ باغی فوج نے کیا تھا۔ میں خود خوف میں جکڑا بے بس قیدی تھا۔ میں نے غربت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میرا ارادہ سرخ چادر اوڑھ کر قطب صاحب، اجمیر اور پھر مکہ چلے جانے کا تھا۔ باغی تو مجھے سلام تک نہیں کرتے تھے۔ وہ میرے دیوان میں گھس جاتے تھے۔ تسبیح خانے میں جوتے لے کر آ جاتے تھے۔ ان باغیوں نے تو خود اپنے افسروں کو مارا تھا۔ وہ نمک حرام تھے۔ ان پر بھروسہ کیسے کیا جا سکتا تھا۔ قاتل وہ تھے۔ میں تو قیدی تھا۔ میرا گواہ خدا ہے اور وہ جانتا ہے کہ میں نے جو لکھا ہے، وہ سچ ہے''۔

عدالت میں وکیلِ صفائی غلام عباس کی پرفارمنس اور جرح کمزور رہی۔ جس طرح کیس آگے بڑھتا گیا، یہ مزید بے تکا ہوتا گیا۔ تکنیکی بنیادوں پر نہیں، الزامات کے حوالے سے۔

ہیریئٹ نے کہا کہ ظفر ایک شاطر چالباز ہیں اور ایک بڑی بین الاقوامی سازش کے سرغنہ ہیں۔ یہ سازش قسطنطیہ، مکہ، تہران اور دلی کے لال قلعے کی دیواروں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا مقصد برٹش سلطنت کو ختم کرنا اور ان کی جگہ مغلوں کو لانا ہے۔ (یہ سب شواہد کے بالکل خلاف تھا۔ حتیٰ کہ بغاوت کرنے والوں میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ دوسرا یہ کہ شیعہ فارس اور سنی عثمانیوں کا کسی بھی مقصد کے لئے اکٹھا ہونا ناممکن تھا)۔ استغاثہ کے وکیل کے مطابق، ''یہ سازش سپاہیوں تک محدود نہیں تھی۔ یہ ان کے شروع کرنے والے بھی نہیں تھے۔ بڑا باغی بہادر شاہ ظفر ہے۔ یہ سازشی شخص جھوٹ اور فساد کا پیکر ہے۔ اس نے ان بدمعاشوں کو اپنے پاس منصوبے کے تحت بلایا۔ اس بڑے جال اور مذہبی جنونیوں کا سرغنہ ہے۔ یہ جنونی ہم پر اور دنیا پر اپنا نظام مسلط کرنا چاہتا تھا''۔

ہیرئیٹ کی پیش کردہ تصویر اس وقت کے برٹش قوم پرست شدت پسندوں کے جذبات کی عکاس تھی۔ تین فروری کو ہیرئیٹ نے ثبوت پیش کرتے ہوئے بتایا کہ باغی سپاہی اور بادشاہ پہلے ہی آپس میں ملے ہوئے تھے۔ یہ طے شدہ تھا۔ درجن بھر باغی اس سے ساڑھے تین سال پہلے ان کے پاس آئے تھے اور ان کے مرید بن گئے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ کئی لوگ بادشاہ کو صوفی پیر سمجھتے تھے۔ بادشاہ مرید قبول کیا کرتے تھے۔ ہیرئیٹ نے اس کو اپنی تخیلاتی عظیم سازش کے نکتے جوڑنے کے لئے استعمال کیا جو ان کے مطابق برسوں کی پلاننگ کا نتیجہ تھی۔

اومانی ڈائری میں لکھتے ہیں ''ہیرئیٹ کی پیشکردہ عظیم سازش کی تھیوری نہ صرف غلط ہے، بلکہ مضحکہ خیز ہے''۔

ایک کے بعد دوسرا پیش ہونے والا گواہ بتا رہا تھا کہ بہادر شاہ ظفر کی ترجیح دہلی کی رعایا کی جان بچانا رہی تھی۔ بادشاہ نے کانپور میں کرسچن قتلِ عام کی شدید مذمت کی تھی۔ دہلی کے لوگوں کو انقلابیوں کی لاقانونیت سے بچانے کی کوشش کی تھی اور لوگوں کو دہلی سے باہر قبائلی ڈاکوؤں سے بچانے کی کوشش کی تھی۔

مقدمہ دو ماہ تک چلتا رہا۔ آخری ہفتوں میں بادشاہ کی آنکھیں کارروائی کے دوران بند ہی رہتیں۔

نو مارچ کو صبح گیارہ بجے کورٹ مارشل آخری بار ہوا۔ پرہجوم عدالت میں ہیرئیٹ نے آخری بار دلائل ڈھائی گھنٹے کے لئے دئے۔ ایک بار پھر انقلاب کو عالمی اسلامی سازش قرار دیا۔ اور بہادر شاہ ظفر کو اس عظیم سازش کا لیڈر نہیں تو اس کا اہم حصہ۔

تین بجے جج فیصلہ سنانے کے لئے صلاح کرنے گئے۔ چند منٹ بعد واپس آئے اور متفقہ فیصلہ سنا دیا۔ بہادر شاہ ظفر پر لگائے گئے تمام الزامات درست قرار دئے گئے۔ فیصلہ سناتے وقت کہا گیا کہ اگرچہ ایسے غدار اور مجرم کی سزا موت ہے لیکن ہوڈسن نے زندگی کی ضمانت دی تھی تو عدالت اس کا احترام کرتی ہے۔ ملزم کو کالاپانی جلاوطن کر دیا جائے یا کسی بھی اور جگہ جسے گورنر جنرل منتخب کریں۔

اگلے سات ماہ جلاوطنی کے لئے مناسب مقام ڈھونڈا جاتا رہا۔ بڑا خدشہ یہ تھا کہ ہندوستانی انہیں چھڑوانے کی کوشش نہ کریں۔ آخر ستمبر 1858 کو فیصلہ کر لیا گیا کہ انہیں دہلی سے نکال لیا جائے۔ اومانی ان کے ساتھ ہوں گے اور یقینی بنائیں گے کہ ریاستی قیدی کسی سے رابطہ نہ کر سکے۔

سات اکتوبر کو صبح چار بجے، پہلے مغل بادشاہ بابر کے دہلی فتح کرنے کے 332 سال بعد آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر بیل گاڑی پر دہلی سے نکل گئے۔ ان کے ساتھ ان کی بیویاں، دو بچے، حرم کی خواتین اور خادم تھے۔ کل اکتیس لوگ ایک سکواڈرن کے ہمراہ دہلی سے نکلے۔ منزل خفیہ تھی۔ بہادر شاہ کو بھی اس کا نہیں بتایا گیا تھا۔ انہیں صبح تین بجے اٹھا دیا گیا تھا اور نکلنے کی تیاری کا کہا گیا تھا۔

صبح کے اندھیرے میں، جب ہر شے رکی ہوئی تھی اور شہر سناٹے میں تھا۔ آخری مغل بادشاہ نے دہلی ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ اس وقت میں انہیں کوئی الوداع کہنے والا نہیں تھا۔

بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی کی جگہ برما طے کی گئی۔ دہلی سے دور اور یہاں کی مقامی آبادی کو ہندوستان کے معاملات سے سروکار نہیں تھا۔ بہادر شاہ سفر میں خوشگوار موڈ میں تھے۔ یہ دہلی کی قید سے بہتر صورتحال تھی۔ سفر کے شروع کے کچھ ہفتے اچھے گزرے۔ راستے میں کہیں پر جلی ہوئی عمارتیں یہ یاد کرواتی تھیں کہ سفر کیا کیوں جا رہا ہے۔ الہ آباد کے

قریب پہنچے تو برٹش فوج شہر پر حملہ آور ہونے کی تیاری میں تھی۔ یہ آخری جگہ تھی جہاں پر برٹش افواج نے بغاوت ختم کی تھی۔

قافلے کی خواتین کے درمیان اختلافات ہو جانے کے سبب آدھی پارٹی الگ ہو گئی اور دہلی واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ بہادر شاہ ظفر کے قافلے میں پندرہ لوگ بچے تھے۔ اٹھارہ نومبر کو یہ مرزاپور پہنچے اور سٹیمر پر سوار ہو گئے۔ بہادر شاہ کے لئے بحری جہاز پر سفر کا یہ پہلا تجربہ تھا۔گنگا میں سفر میں اس کے شاندار گھاٹ، بنارس کی عمارتیں، برٹش جنگی کشتیاں جو بکسار کی جنگ سے بھاگنے والے انقلابیوں کی نگرانی کے لئے تھیں۔۔۔ یہ سب بہادر شاہ کے لئے نئے نظارے تھے۔ بکسار وہ مقام تھا جہاں مغل اور برٹش پہلی بار 1764 میں آمنے سامنے آئے تھے۔ رامپور میں سٹیمر تبدیل کیا اور چار دسمبر کو کلکتہ پہنچ گئے۔

یہاں سے بحری جنگی جہاز ماگارا پر سوار کر دیا گیا۔ پانچ روز کے بعد یہ سمندر پار کر کے دریائے رنگون داخل ہو گیا۔ رنگون کی بندرگاہ پر بہت سے لوگ قیدی کو دیکھنے آئے تھے۔

اپریل 1852 کو کمپنی کی فوج نے جس میں سکھ رجمنٹ تھی، رنگون پر حملہ کیا تھا۔ برمی فوج کو منڈالے تک پیچھے دھکیل دیا گیا تھا۔ یہاں پر بھی مالِ غنیمت تلاش کرنے والوں نے شہر کو لوٹا تھا اور شہر کی عبادت گاہوں میں بت توڑ دئے تھے تاکہ جواہرات تلاش کئے جا سکیں۔ رنگون کو بھی دہلی کی طرح ری ماڈل کیا جا رہا تھا۔

شکل 22: بہادر شاہ ظفر کی جوانی کی تصویر۔

اب کمپنی حکومت کے زیرِانتظام رنگون آخری مغل بادشاہ کے آخری برسوں میں قیام کے لئے جگہ تھی۔

شکل 23: بہادر شاہ ظفر دربار میں۔

شکل 24: بہادر شاہ ظفر کی تصویر جو تھامس میٹکاف نے مصور سے بنوائی تھی۔
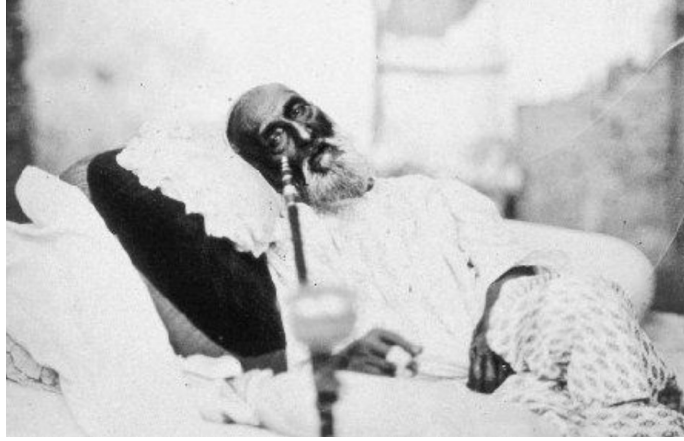
شکل 25: بہادر شاہ ظفر کی دہلی میں مقدمے کے دنوں کی تصویر۔

بادشاہ کے بعد

]''لگتا ہے پورا شہر مسمار کیا جارہا ہے۔ خاص بازار، اردو بازار اور خانم کا بازار غائب ہو چکے ہیں۔ یہ بھی نہیں پتا لگتا کہ وہ کہاں تھے۔ گھر والے اور دکاندار اشارہ کر کے بھی نہیں بتا سکتے کہ ان کی دکان اور گھر کدھر تھے۔ کھانا مہنگا ہے اور موت سستی''۔
غالب کا لکھا یہ پیراگراف ایک منصوبے پر ہونے والے عملدرآمد کا بتا رہا تھا۔ اصل پلان تو زیادہ بڑا تھا اور لاہور کرونیکل میں شائع ہوا تھا۔ ''سزا کے طور پر دہلی کا نام و نشان مٹا دیا جائے''۔ اس پلان کے بہت سپورٹر تھے۔ ہندوستان میں بھی اور لندن میں بھی۔ لارڈ پامرسٹون نے کہا کہ دہلی کو نقشے سے ہی ختم کر دیا جائے اور ہر عمارت کو، خواہ کتنی ہی اہم ہو یا کتنی ہی آرٹسٹک، بلاتمیز ختم کر دیا جائے۔ گورنر جنرل کیننگ اس تجویز کی حمایت میں تھے لیکن جو شخص انہیں اس سے منع رکھنے میں کامیاب رہے، وہ جان لارنس تھے۔

جان لارنس کو لاہور سے دہلی فروری 1858 کو ٹرانسفر کیا گیا۔ وہ اس سے پہلے پنجاب کے چیف کمشنر رہے تھے اور دہلی کو فتح کرنے میں بڑا ہاتھ تھا، اس وجہ سے ان کی رائے اثر رکھتی تھی۔ وہ قتلِ عام اور دہلی میں پھیلائی جانے والے تباہی کے مخالف تھے۔ سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ قتلِ عام کے پرجوش حامی اور اپنے پیشرو تھیو میٹکاف کو جلاوطن کر دیا اور جبری رخصت پر انگلستان بھجوا دیا۔ 2 مارچ کو تھیو ہمیشہ کے لئے ہندوستان چھوڑ گئے۔

اپریل کو لارنس نے عام معافی دینے کی سفارش کی۔ غیرمتوقع طور پر اس میں انہیں اپنے حامی بنجمن ڈسرائیلی کی صورت میں مل گئے (جو بعد میں برطانوی وزیرِاعظم بنے) جنہوں نے برطانوی پارلیمنٹ میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''میں نے وہ سنا ہے اور وہ پڑھا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ مسیح کے نام پر ہم مسیح کے بجائے مولک کا طریقہ اپنا رہے ہیں''۔ (مولک کنعان میں دیوتا تھا جس کے آگے بچوں کو بھینٹ چڑھایا جاتا تھا)۔

یکم نومبر 1858 کو ملکہ وکٹوریا کے جاری کردہ فرمان سے یہ سرکاری پالیسی بن گئی۔ اس کے ساتھ Act for Better Government of India عمل میں آ گیا۔ تاجِ برطانیہ نے ہندوستان کی حکومتی ذمہ داری ایسٹ انڈیا کمپنی سے ختم کر کے خود اپنے پاس لے لی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی چوبیس ہزار کی ملٹری فورس برٹش آرمی کا حصہ بن گئی۔

غداری کے مقدمے اور پھانسیوں کے سلسلے ختم ہوئے۔ ہندوستان اپنے شئیرہولڈرز کے لئے کام کرنے والی ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی حکمرانی کے بجائے باضابطہ کالونیل حکومت میں آ گیا۔

دہلی کو مسمار کئے جانے پر بحث چلتی رہی۔ کیننگ نے دہلی کی دیواروں اور دفاعی حصار کو مسمار کرنے کے احکامات جاری کر دئے تھے لیکن لارنس نے انہیں رکوا دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اتنے میل لمبی دیوار گرانے کے لئے بارود دستیاب نہیں۔ 1859 کے آخر تک کچھ حصہ گرانے پر اتفاق ہو گیا۔ 1863 میں چاندنی چوک سے ضریبہ تک مسماری کا آپریشن جاری رہا جو اس کے بعد ترک کر دیا گیا۔ اس دوران دہلی کا بہت سے حصہ گر چکا تھا جس کا ذکر غالب اپنے خطوط میں اداسی سے کرتے رہے۔ راج گھاٹ (جو دریائے جمنا کے پاس مشرق میں تھا) سے جامع مسجد کے درمیان بلامبالغہ صرف اینٹوں کا ڈھیر تھا۔ غالب کے خط کا اقتباس۔

''راج گھاٹ کے دروازے کو گرا دیا گیا ہے۔ ملبے کا ڈھیر ہے۔ چوڑی سڑک بنانے کے لئے کلکتہ دروازے اور کابل دروازے کے درمیان زمین ہموار کی گئی ہے۔ پنجابی کٹہرا، دھوبی وارا، رام جی گنج، سادات خان کا کٹہرا، مبارک بیگم کی حویلی (جو اوکٹرلونی کی بیوہ تھیں)، صاحب رام کی حویلی اور باغ ۔ اب کچھ بھی باقی نہیں رہا''۔

غالب کے دوسرے خطوط میں اکبرآبادی مسجد، کشمیری کٹہرا مسجد، شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کے مزار، مولوی باقر کے امام باڑہ، بلقی بیگم کے محلے، ضریبہ کے دروازے کے منہدم ہونے کا ذکر ہے۔ شہر کے چار بڑے شاندار محل مکمل طور پر مسمار کئے گئے۔ جس میں جھاجر کے نواب کی حویلی، بہادر گڑھ اور فرخ گڑھ کے نواب اور بلب گڑھ کے راجہ کی حویلی تھی۔ شالیمار باغ، جہاں اورنگزیب کی تاجپوشی ہوئی تھی، کو زرعی اراضی کے طور پر نیلام کر دیا گیا۔ جہاں مغل عمارتیں نہیں گرائی گئیں، ان کے نام بدل دئے گئے۔ بیگم باغ اب کوئنز گارڈن ہو گیا۔

لارنس نے کوشش کی تھی کہ لال قلعے کو بچایا جا سکے لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ انہوں نے جامعہ مسجد اور محل کی دیواروں کو بچا لیا لیکن لال قلعے کا اسی فیصد حصہ ڈھا دیا گیا۔ ہئیریٹ ٹیلر اس سب پر رنجیدہ تھیں۔ انہوں نے دہلی کی دیوانِ عام کے اوپر سے تصویر بنائی ہے جو مغلیہ دہلی کی آخری تصویر ہے۔ انہوں نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے، ''دہلی میں موت کا سناٹا تھا۔ خالی گھر اور ہو کا عالم۔ جیسے کسی بدن سے روح نکل گئی ہو''۔

لال قلعے کو نومبر 1857 سے مسمار کئے جانا شروع ہوا۔ سب سے پہلے شاہی حمام سے یہ کام شروع کیا۔ آرکیٹکچر کے مورخ جیمز فرگوسن لکھتے ہیں کہ یہ قلعہ یورپ کے کسی بھی قلعے سے دگنا ہو گا۔ مارچ 1859 تک یہ جاری تھا۔ چھوٹا رنگ محل، حیات بخش باغ، مہتاب باغ ختم ہوئے۔ دریائے جمنا کے کنارے اس کا بیس فیصد حصہ بچ گیا اور یہ بچت اس لئے ہوئی کہ اس کو برٹش فوجیوں نے اپنا آفس اور میس بنا لیا تھا۔

گنبد اور سنگِ مرمر کی فٹنگ کو اتار لیا گیا اور مالِ غنیمت میں داخل کر دیا۔اس میں شاہ جہان کا کروایا گیا پرچین کاری کا شاندار کام بھی تھا جو ان کے تخت طاوس کے پیچھے تھا۔ نقار خانہ، جہاں اصفہان یا قسطنطنیہ سے سفیروں جیسے اہم مہمانوں کی آمد پر باجے اور ڈھول بجائے جاتے تھے، برٹش سٹاف سارجنٹ کے کوارٹر بن گیا، دیوانِ عام آفیسرز لاونج میں تبدیل ہوا۔ شاہی خوابگاہ کینٹین بن گئی، رنگ محل آفیسرز میس میں بدل گیا۔ ممتاز محل کو ملٹری جیل بنا دیا گیا۔ لاہور دروازے کا نام وکٹوریا گیٹ رکھ دیا گیا۔ ظفر محل، جو تیرتا پویلین تھا، افسروں کے لئے سوئمنگ پول۔ جب کہ حیات بخش باغ کے خیمے ٹوائلٹ بنے۔

بغاوت کے ایک سال بعد پہلے شہر میں دہلی کے ہندوؤں کو واپس آنے کی اجازت آہستہ آہستہ ملنے لگی۔ دسمبر 1859 میں دہلی کے مسلمانوں کی طرف سے ملکہ وکٹوریا کو درخواست کی گئی کہ انہیں بھی واپس آنے دیا جائے، وہ مشکل میں ہیں اور ملکہ سے رحم کی توقع کرتے ہیں کہ وہ انہں معاف کریں گی اور واپس دہلی جانے دیں گی۔ ان کے پاس نہ سر پر چھت ہے اور نہ سردی سے بچنے کا انتظام۔ یہ اجازت مل گئی، لیکن جو تاجِ برطانیہ سے اپنی وفاداری ثابت نہیں کر سکے، ان کے گھر ضبط کر لیے گئے۔ مسلمانوں کے خلاف تعصب کی صورتحال اتنی بری تھی کہ برٹش پریس میں آوازیں اٹھنے لگیں۔ جون 1860 میں موفصلائیٹ میں اس پر لکھا مضمون ہے، ''ہمارا غصہ، آخر کب تک؟''۔

ضبط شدہ جائیدادیں نیلام ہوئیں۔ ان کو خریدنے والے زیادہ تر ہندو کھشتریہ اور جین بینکار تھے، جیسا کہ چُنا مل یا رام جی داس یا مہیش داس۔ چنا مل نے فتح پوری مسجد بھی خرید لی جبکہ ایک ہندو نانبائی نے زینت المساجد خریدی۔ مغل دور کی اشرافیہ اب یا تو غربت میں تھی یا کچھ لوگوں کو سکول ٹیچر یا ٹیوٹر جیسے کام مل گئے تھے۔

مرزا غالب نے جنوری 1862 میں دوست کو خط لکھا ہے۔ ''یہ وہ دلی نہیں جہاں تم پیدا ہوئے تھے، سکول گئے تھے، جہاں تم میرے گھر آیا کرتے تھے۔ یہ وہ دلی نہیں جہاں میں نے اکاون برس گزارے۔ یہ ایک کیمپ ہے۔ مسلمان یا تو ہنرمند ہیں یا برٹش کے ملازم۔ باقی سب ہندو ہیں۔ شاہی خاندان کے مرد اب برٹش سرکار سے پانچ روپے مہینہ وصول کرتے ہیں۔ شاہی محل کی خواتین اگر زیادہ عمر کی ہیں تو دلالہ ہیں، کم عمر کی ہیں تو طوائف''۔ (برٹش سرکار نے نئے قوانین کے تحت عام معافی کے علاوہ شاہی خاندان کے افراد کی تاحیات پانچ روپے مہینہ پنشن مقرر کر دی تھی)۔

مغلوں کے خاتمہ کے ساتھ ہی دہلی کے ادب اور کلچر کا خاتمہ ہوا۔ لائبریریاں تباہ ہوئیں۔ مسودے ضائع ہو گئے۔ مدارس بند کر دئے گئے۔ سب سے بڑی درسگاہ مدرسہ رحیمیہ رام جی داس نے نیلام میں خریدی اور اسے گودام بنا لیا۔

غالب شکوہ کرتے ہیں کہ کتابوں کے اس شہر میں ایک بھی کتاب فروش نہیں رہا، جلدساز یا خطاط نہیں رہا۔ شاعر غائب ہو گئے۔ ''ممنون کہاں ہے؟ ذوق کہاں ہے؟ مومن خان کہاں ہے؟ دو باقی بچے ہیں۔ ایک آزردہ جو خاموش ہے اور دوسرا غالب جو گم ہے اور حواس میں نہیں۔ کوئی شعر کہنے والا نہیں اور کوئی شعر کا قدردان نہیں''۔ غالب کا اپنا بہت سا کام ضائع ہوا۔ وہ اپنی غزلوں کی کاپیاں اپنے پاس نہیں رکھتے تھے۔ ان کے دوستوں کی نجی لائبریریاں جہاں یہ موجود تھیں، تباہ ہونے کے ساتھ غالب کا بہت سا کام بھی چلا گیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں، ''کچھ روز پہلے ایک خوش الحان فقیر تھا جسے میری غزل کہیں سے ملی تھی اور اس نے اسے لکھ لیا تھا۔ جب اس نے مجھے دکھائی تو میری آنکھ میں آنسو آ گئے''۔

ایک اور 1861 کے خط میں، ''شہر صحرا بن گیا ہے۔ دلی والے اپنی زبان پر فخر کرتے ہیں لیکن یہ کیا بے کار کی باتیں ہیں۔ اردو بازار تک تو بچا نہیں، اردو نے کہاں بچنا ہے۔ دہلی کو چار چیزیں زندہ رکھتی تھیں۔ قلعہ، جامعہ مسجد کا مجمع، جمنا کی سیر اور سالانہ پھولوں کا میلہ۔ ان میں سے کچھ نہیں رہا تو دلی کہاں رہ سکتا تھا۔ ہاں، ہندوستان میں کبھی اس نام کا بھی ایک شہر ہوا کرتا تھا''۔

ایک اور خط میں، ''آنسو پیاس نہیں بجھاتے۔ جب مایوسی حد سے بڑھتی ہے تو خود کو بس خدا کی رضا کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ مجھے اب بس موت کی امید ہے جو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ میری روح جسم میں ویسے ہے جیسے قفس میں بے قرار پرندہ''۔

نہ دہلی کالج رہا اور نہ مدرسے، نہ چھاپہ خانے اور نہ اردو اخبار اور مغل دربار کی سرپرستی کے بغیر دہلی کے آرٹ مرجھا گئے۔ انڈواسلامک تہذیب ختم ہوئی۔ غالب نے موت سے کچھ قبل لکھا، ''یہ سب بس اس وقت تک تھا، جب تک بادشاہ تھے''۔
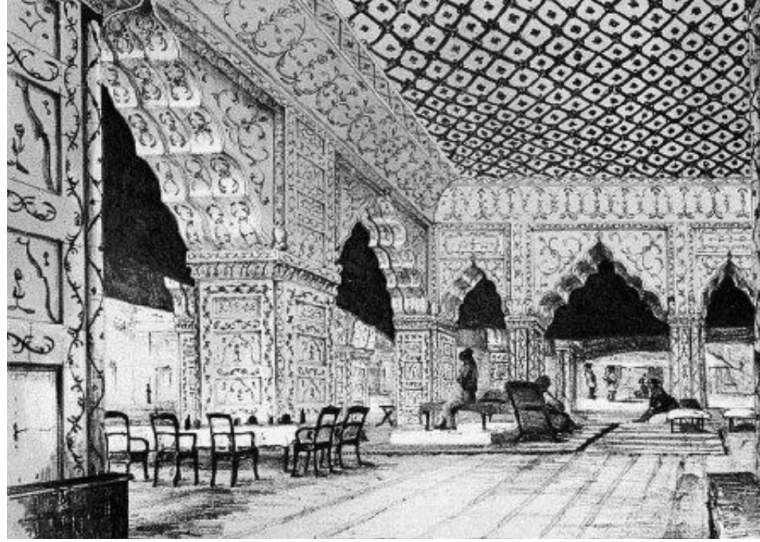
شکل 26: لال قلعے کے دیوانِ خاص کی تصویر۔ اس کو آفیسرز میس بنا لیا گیا تھا۔

مورخ جیمز فرگوسن لکھتے ہیں کہ ''جو دہلی میں ہوا، وہ تباہی تھی۔ اس کے علاوہ ایسا صرف پیکنگ میں ہوا۔ اس کی کوئی وجہ نہ تھی، کوئی جواز نہ تھا۔ ایک وقت میں قسطنطنیہ اور کینٹن کے درمیان اس کے پائے کا کوئی شہر نہ تھا۔ حمام اور باغ، ہزار ستونوں کے ہال اور شاندار مقبرے، صوفی خانقاہیں اور مساجد''۔ اک شہر تھا، جو ختم ہوا۔

سرکاری قیدی

اپریل 1859 کو بہادر شاہ ظفر کو نئی رہائش گاہ منتقل کر دیا گیا۔ اس میں چار چھوٹے کمرے تھے۔ ایک سابق بادشاہ کے پاس تھا۔ ایک ان کے بیٹے جوان بخت اور بہو کے پاس۔ ایک زینت محل کے پاس اور ایک چھوٹے بیٹے شاہ عباس اور ان کی والدہ کے پاس۔ ساتھ آنے والے چار خادم واپس انڈیا چلے گئے۔ باقی گھر کے برآمدے میں ہوتے۔ گھر کے اوپر کی منزل کو چق ڈال کر ڈھکا گیا تھا۔ بادشاہ اور بیٹے یہاں بیٹھ کر وقت گزارتے۔ سمندری ہوا کے جھونکے آتے اور اچھا منظر تھا۔ راہگیروں کو گزرتے دیکھنا اور جہاز دیکھنا مقید زندگی کی یکسانیت توڑتا تھا۔ دو سے تین سنتری پہرے پر مقرر تھے۔ اس سب کے لئے گیارہ روپے روزانہ دئے جاتے تھے۔ اتوار کو ایک اضافی روپیہ اور پہلی تاریخ کو اضافہ دو روپے۔

ان سے وہ کچھ سامان خرید لیتے جیسے ٹوائلٹ کی چیزیں۔ قلم، دوات اور کاغذ سختی سے منع تھا۔ بہشتی، دھوبی اور صفائی والا ہندوستانی تھے۔ لوگوں سے میل ملاقات کی اجازت نہیں تھی۔ کام کرنے والے اجازت نامے کے ساتھ ہی جا سکتے تھے۔

اومانی کے جانے کے بعد اگلے جیلر ڈیویس تھے۔ وہ بہادر شاہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ”ان کی یادداشت اچھی ہے لیکن دانت نہ ہونے کی وجہ سے کئی بار ان کی بات سمجھ نہیں آتی۔ ایسا نہیں لگتا کہ وہ اب زیادہ ذہنی توانائی رکھتے ہیں لیکن چھیاسی برس کی عمر کے لحاظ سے صحت اچھی ہے۔ زیادہ وقت گم سم گزارتے ہیں۔ اور بہت دیر سے کسی چیز میں دلچسپی نہیں لے رہے“۔

زینت محل سے ڈیویس کی بیوی نے ملاقات کی اور ان کا کہنا تھا۔ ”اچھی صحت ہے اور بتاتی ہیں کہ ان کا بہت سا خزانہ اور زیورات اور جائیداد گم گئے ہیں۔ ہوڈسن نے ان سے لکھ کر وعدہ کیا تھا کہ وہ محفوظ رہیں گی۔ کہتی ہیں کہ ہوڈسن نے تو انہیں سنبھال کر رکھا لیکن دہلی کے کمشنر نے یہ سب ہڑپ کر لیا اور وہ دستاویز بھی۔ یہ سب بیس لاکھ روپے کی مالیت کا تھا۔ میں نے بتایا کہ ان کے شوہر کو سزا ہوئی ہے اور تمام مال بحقِ سرکار ضبط ہو چکا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نے انہیں کوئی امید نہیں دلائی کہ انہیں یہ واپس ملے گا“۔

اس کے بعد شاہ زمانی بیگم کے بارے میں (جو بہادر شاہ ظفر کی بہو تھیں)۔ ”نوجوان اور خوبصورت لڑکی ہے جس کی عمر پندرہ سال کے قریب ہو گی۔ دو بچوں کو جنم دے چکی ہے۔ (شاہ زمانی بیگم کی شادی دس سال کی عمر میں گیارہ سالہ شہزادے جوان بخت سے ہوئی تھی اور یہ دہلی کی تاریخ کا سب سے شاندار فنکشن سمجھا جاتا تھا)۔ قید کی زندگی کا سب سے برا اثر اس پر ہوا ہے۔ ایک بچہ رنگون آمد کے کچھ دیر بعد ہی ہوا تھا لیکن وہ لڑکا بچ نہ سکا۔ زمانی بیگم کا بہت اصرار تھا کہ سیر کو جانے کی اجازت دی جایا کرے“۔

بہادر شاہ کے بیٹوں مرزا جوان بخت اور شاہ عباس کے بارے میں۔ ”دونوں بیٹے صحتمند ہیں۔ بڑا لڑکا جوان بخت مغرور طبیعت کا ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ ملکہ کا بیٹا تھا جبکہ اس کا چھوٹا سوتیلا بھائی خادمہ کا۔ دونوں بالکل ہی ان پڑھ ہیں۔ بڑا بیٹا فارسی کو تھوڑا سا لکھنا پڑھنا جانتا ہے لیکن عام چیزوں کے بارے میں بھی کوئی معلومات نہیں۔ انہیں اپنے ملک کے بارے میں یا ان کی سرحدوں کا بھی پتا نہیں ہے۔ لیکن وہ سیکھنے میں دلچسپی دکھاتے ہیں۔ میں اس کو اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ حکومت کے علم میں یہ بات لاؤں کہ دونوں پڑھنا چاہتے ہیں اور خاص طور پر انگریزی زبان سیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں پڑھنے کے لئے انگلستان بھیجا جائے۔ دونوں الگ الگ یہ بات کہہ چکے ہیں۔ دونوں ذہین ہیں اور جلد پروگریس کر سکیں گے۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ اگر حکومت نے مدد کی تو وہ پوری محنت کریں گے۔ میں نے انہیں

بتا دیا ہے کہ میں ان کی خواہش حکومت تک پہنچا دوں گا۔ بہادر شاہ ظفر اور زینت محل کی بھی یہی خواہش ہے۔ ان کے والد کی زندگی کے زیادہ دن نہیں بچے۔ ہمیں ابھی سوچ لینا چاہیے کہ ان کے بچوں کے ساتھ آخر کرنا کیا ہے"۔

ڈیوئس کی تجویز کو فوری طور پر کلکتہ میں رد کر دیا گیا اور انہیں جھاڑ پلا کر کہا گیا کہ آئندہ خطوط میں ایسے چھوٹے موٹے معاملات کا ذکر نہ کریں جن کا حکومت سے سروکار نہیں۔ ڈیویس کو اس پر بھی سرزنش کی گئی کہ انہوں نے بہادر شاہ ظفر کے لئے سابق بادشاہ اور زینت محل کے لئے بیگم کا لفظ استعمال کیا تھا اور بتایا گیا کہ انہیں صرف دہلی کا سرکاری قیدی کہا جائے۔

ان دونوں لڑکوں کے پاس کسی بھی قسم کی تعلیم کا واحد راستہ ڈیویس اور مسز ڈیویس تھے اور لڑکے ان کے گھر باقاعدگی سے جاتے۔ ان کے لکھے دوسری خطوط جوان بخت کی بڑھتی بے رخی کا ذکر کرتے ہیں۔ شاہ عباس سنتری کے ساتھ سیر پر چلے جایا کرتے۔ جوان بخت نے کسی کی گارڈ میں جانے سے انکار کر دیا۔

بہادر شاہ ظفر کے پاس نہ قلم تھا اور نہ کاغذ۔ ہم صرف اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جلاوطنی اور تنہائی کی زندگی میں وہ کیا محسوس کرتے تھے۔ اور ان کی مشہور اداس اور تلخ نظمیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے قید میں لکھیں، غالباً ان کی لکھی نظمیں نہیں۔ نہ ہی وہ ان کی دیوان کا حصہ ہیں اور نہ ہی رنگون میں لکھی کسی شاعری کے ریکارڈ ہونے کا امکان تھا۔

بہادر شاہ ظفر 1862 میں 87 برس کے ہو چکے تھے۔ اگرچہ کمزور تھے لیکن صحت مجموعی طور پر ٹھیک رہی تھی۔ موسمِ برسات کے بعد اکتوبر کے آخر میں ان کی حالت اچانک بگڑ گئی۔ کچھ نگل نہیں سکتے تھے اور کھانا پینا محال ہو گیا تھا۔ انہیں یخنی پلائی جاتی تھی لیکن پھر وہ بھی مشکل ہو گیا۔ 5 نومبر کو سول سرجن نے رپورٹ دی کہ ان کا بچنا مشکل ہے۔

ڈیویس نے ایک تنہا جگہ پر قبر بنانے کی تیاری کر لی۔ رات بھر کی تکلیف کے بعد بروزِ جمعہ 7 نومبر 1862 کو صبح پانچ بجے بہادر شاہ ظفر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

برٹش مشینری فوری حرکت میں آ گئی۔ یہ خاموشی سے ہو جائے۔ کم سے کم لوگ اس کو دیکھ سکیں۔ شام چار بجے مین گارڈ کے پاس قبر میں انہیں دفنا دیا گیا۔ اس کو ڈھک کر اوپر سے مٹی ڈال کر میدان ہموار کر دیا گیا۔ ساڑھے تین سو سال ہندوستان پر حکومت کرنے والے خاندان کے آخری بادشاہ کی زندگی تمام ہوئی۔ اس علاقے کے گرد باڑ لگا کر الگ کر دیا گیا۔ جب تک یہ باڑ ختم ہوئی، گھاس اگ کر قبر کو بے نشان کر چکی تھی۔

اگلے روز ڈیویس نے اپنی سرکاری رپورٹ بھیجی، "اس واقعے کا یہاں کچھ اثر نہیں ہوا۔ نہ ہی پسماندگان پر اور نہ ہی یہاں کی مسلمان آبادی پر۔ شاید دو سو کے قریب لوگ دیکھنے والے تھے لیکن یہ راہگیر تھے جو قریب کے صدر بازار سے شہر کی طرف ریس دیکھنے جا رہے تھے"۔

دو ہفتے بعد بہادر شاہ ظفر کے موت کی خبر دہلی پہنچی جو غالب نے اودھ اخبار میں بیس نومبر کو پڑھی۔ یہی وہ دن تھا جب جامعہ مسجد مسلمانوں کو واپس کر دی گئی تھی۔ غالب، جو بہت سے لوگوں کی اموات دیکھ چکے تھے، کا ردِ عمل زیادہ نہ تھا، انہوں نے لکھا، "بروز جمعہ، سات نومبر اور چودہ جمادی الاول کو، ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ اپنے جسم کی قید سے آزاد ہو گئے۔ بے شک ہم سب نے لوٹ کر خدا کی طرف ہی جانا ہے"۔

کسی اخبار، نہ برٹش اور نہ انڈین، نے بہادر شاہ کی موت کی خبر کو زیادہ جگہ دی۔ اس قدر خون بہہ چکا تھا، اس قدر جنازے اٹھائے جا چکے تھے اور ایک طرح سے بہادر شاہ ظفر کا سوگ پہلے ہی منا لیا گیا تھا اور بھلا دیا گیا تھا اور انہیں دہلی سے گئے ہوئے پانچ برس ہو چکے تھے۔

آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ہی اندازہ ہوا کہ یہ کتنا بڑا خلا تھا۔ انقلاب کے وقت بغیر کسی کے کہے ہندو اور مسلمانوں کا مغلوں کی قیادت میں خودبخود اکٹھے ہو جانا ایک حیرت انگیز مثال تھی کہ اگرچہ ان کے پاس عملی، سیاسی، عسکری یا اکنامک طاقت تو ایک سو سال سے نہیں تھی لیکن سب کی ہی توقع کے خلاف پادشاہ کی کشش زندہ تھی۔

اور آج کے جدید مورخین بھی یہ نکتہ نظرانداز کرتے ہیں کہ ہندوؤں کے لئے بھی اس میں اتنی ہی کشش تھی جتنی مسلمانوں کے لئے۔ جدید مورخین کاٰ ایک حصہ، خاص طور پر ہندوستان کا رائٹ ونگ، مسلمانوں کو ہندوستان میں آنے والے بیرونی حملہ آور کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن بغاوت کے وقت کے واقعات ہمیں بتاتے ہیں کہ ہندو بھی اپنی قیادت کے لئے مغل دربار کی طرف ہی دیکھتے تھے۔ اور انہوں نے بھی برٹش کالونیل راج کے خلاف مغلوں کے راج کو واپس لانے کی کوشش کی تھی۔

اور دوسری طرف، بغاوت جہاں ہمیں مغل نام کی طاقت کا دکھاتی ہے، وہیں پر اس کی ناکامی فرسودہ مغل فیوڈل آرڈر کی ناکامی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں انتظامی صلاحیت کا شدید فقدان تھا۔ گورننس کا فرسودہ نظام تھا۔ ٹیکس اکٹھا کرنے کا، امن و امان قائم رکھنے کا طریقہ نہیں تھا۔ فوج کو خوراک فراہم کرنے کے لاجسٹکس نہیں تھے۔ بہادر شاہ ظفر خود کمزور حکمران تھے۔ اپنے پیشروؤں کی طرح بادشاہت کی لڑی کے ایک اور نااہل حکمران تھے۔ مغل فیوڈل آرڈر جدید دنیا میں کام نہیں کرتا تھا۔ یہ کسی ایک شخص یا خاندان کی نہیں، نظام کی ناکامی تھی۔

صرف دہلی ہی نہیں، ہندوستان میں ہر جگہ پر سیاسی آرڈر ہر طرح سے ناکام رہا تھا۔ فاقہ زدگی کا شکار صرف سپاہی نہیں تھے۔ ہندوستان کی عظیم اور شاندار سلطنت ہزاروں میل دور سے آنے والے مٹھی بھر سپاہیوں کے ہاتھوں اپنے تابناک ماضی کے ساتھ زمین بوس ہو گئی۔ برٹش افواج نے دہلی کا کشمیری دروازہ جب دھماکے سے اڑایا تھا تو یہ بس اسے لگنے والا ایک آخری دھکا تھا۔

ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ ناکام ہو جانے والے نظام اپنے ناکام ہو جانے کے بعد بھی چلتے رہتے ہیں لیکن جب گرتے ہیں تو بہت کچھ بہا لے جاتے ہیں، بہت کچھ دفن کر دیتے ہیں۔ یہی تاریخ کی کہانی ہے۔

شکل 27: مرزا جوان بخت اور مرزا شاہ عباس کی تصویر۔ یہ دو شہزادے بہادر شاہ کے ساتھ جلاوطن ہوئے تھے۔

انقلاب کے بعد

جب دہلی گرا تو نہ صرف شہر اور مغلیہ دربار ختم ہوا بلکہ مغلوں کے ساتھ منسلک سیاسی اور کلچرل خوداعتمادی اور اتھارٹی بھی۔ یہ شکست جس قدر فاش تھی اور جس قدر بڑی تباہی اور جس قدر ذلت، اس نے نہ صرف پرانی اشرافیہ کے نظام کو زمین بوس کیا بلکہ ہندو مسلم تعلقات کا بھی تیاپانچہ کر دیا۔ انڈواسلامک تہذیب کا بھی۔ رواداری کی روایات کا بھی۔ غالب کی غزلوں کا بھی۔

برٹش کے لئے 1857 کے بعد مسلمان کمتر انسان ہو گئے۔ اور اس بارے میں اس دور میں ویسا متعصب رویہ نظر آتا ہے جیسے برٹش کا اس وقت میں آئرش کیتھولک یا یہودیوں کے بارے میں تھا۔ اور دوسری طرف ہندوستانی آبادی کے کچھ حصے میں بھی خود پر اعتمادی کی کمی اور اپنے کلچر اور روایات کو مکمل طور پر مسترد کر دینے والا رویہ سرایت کر گیا۔

مغل فوج برٹش جنرلوں کے آگے ناکارہ ثابت ہوئی تھی۔ مرزا مغل کی انتظامی امور کی کوششوں کا کمپنی کی بیوروکریسی سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ یہ ہر لحاظ سے فاش شکست تھی۔ لیکن یہ شکست کلچر کی شکست بھی بن گئی۔ مغل مینیچر پینٹنگ کا آرٹ گم ہو گیا۔ دہلی کی روایتی شائستگی کا کلچر بھی نہ رہا۔ مشاعروں میں دانشوروں کے لئے کشش ختم ہو گئی۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں، ''جیتنے والی کی ہر چیز اپنا لی جاتی ہے اور فخر سے اپنائی جاتی ہے۔ شکست بہت کچھ ساتھ لے ڈوبتی ہے''۔

ظاہر ہے کہ ہر تبدیلی منفی نہیں تھی۔ مغل دور کے آٹوکریٹک سیاسی سٹرکچر ختم ہو گئے۔ اس کے صرف نوے سال بعد برٹش نے ہندوستان چھوڑ دیا۔ اس وقت تک نیشلزم جاگ چکا تھا۔ ملک کی مہار اور فیصلے صرف اشرافیہ کے چند لوگوں کے ہاتھوں میں نہیں رہےتھے۔ نہ مغلوں کے جانشینوں کے پاس، نہ فیوڈل حکمرانوں کے اور شہزادوں کے پاس۔ برطانیہ سے آزادی کی تحریک اشرافیہ کی تحریک نہیں تھی۔ عوام کی تحریک تھی۔ اور اس کے اہم کردار وہ تھے جو انگلش اداروں میں پڑھے تھے، کالونیل سروس میں رہے تھے۔ مغربی جمہوری نظام کو اور طریقوں کو جانتے تھے۔ ان کا طریقہ بندوقیں، تلوار، ڈنڈے اور گنڈاسے لے کر مرنے مارنے کا نہیں تھا۔ سیاسی پارٹیاں، ہڑتال، احتجاجی مارچ، عوامی کنویسنگ اور ووٹ کا تھا اور یہ کامیاب رہے۔

آج کے آگرہ کے چوک میں جھانسی کی رانی، شیوا جی اور سبھاس چندرا بوس کے مجسمے تو ہیں، مغلوں کے بارے میں کچھ نہیں۔ آج کے انڈیا اور پاکستان میں مغلوں کا (صحیح یا غلط) تاثر وہی ہے جو 1857 کے بعد ترتیب دئے گئے تعلیمی نصاب کا حصہ بنا۔ جس میں مغلوں کو مندر گرانے والے، عیش و عشرت کے دلدادہ اور عیاش حملہ آوروں کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ اکبر، داراشکوہ اور بعد تک آنے والوں کے بارے میں اور ان کی شاندار اور کثیرالقومی تہذیب کے بارے میں جدید انڈیا اور پاکستان میں واقفیت نہیں۔ ماسوائے کوئی مغلیہ پکوان کھا لینے یا ان کے بارے میں بالی وڈ کی کوئی فلم دیکھنے سے زیادہ بالکل نہیں۔

بہادر شاہ ظفر کے بارے میں عام طور پر ایک ہمدردی کا تاثر پایا جاتا ہے۔ لیکن گمشدہ سلطنت کا رومانس مغل کلچر بچانے کے لئے کافی نہیں تھا۔ انقلاب کے بارے میں ان کا متذبذب رویہ، پہلے اقرار، پھر نیم رضامندی اور آخر میں انکار اور کمزور لیڈرشپ۔ انہوں نے اپنے حمایتیوں کے لئے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔ حتیٰ کہ کوئی باربط سیاسی آئیڈیا بھی نہیں۔ کہ آخر وہ لڑ کس لئے رہے تھے؟ ان کی موت کے سات سال بعد مرزا غالب کی وفات ہو گئی۔ اس وقت تک ایک پوری تہذیب کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ وہ تہذیب پھر کبھی واپس نہیں آئی۔

جس سال غالب کی وفات ہوئی، اسی سال گجرات میں 1869 میں ایک لڑکے کی پیدائش ہوئی جس کا نام مہنداس کرمچند گاندھی رکھا گیا۔ اور اس کے سات سال بعد کراچی میں محمد علی جناح کی۔ ہندوستان کے مستقبل کی سیاست نہ ہی بہادر شاہ ظفر کی تھی اور نہ ہی لارڈ کیننگ والی، نئی سیاست اس نئی آنے والی نسل کی تھی۔

بہادر شاہ ظفر کے بعد شاہی خاندان بکھر گیا جیسا ڈیویس نے اپنی اگلی رپورٹ میں لکھا۔ زینت محل اور ان کی بہو کا شدید جھگڑا تھا۔ ایک ہی گھر میں تین گروپ تھے۔ ایک زینت محل، دوسرا جوان بخت اور بیوی، تیسرا شاہ عباس اور ان کی

والدہ۔ تینوں اپنا کھانا الگ پکاتے اور الگ کھاتے۔ ان کی آپس میں بات چیت نہیں تھی۔

وقت کے ساتھ یہ حالات بدتر ہوتے گئے۔ 1867 میں ان کی قید ختم ہو گئی اور انہیں گھر چھوڑنے کی اجازت مل گئی۔ شاہ زمانی بیگم جو دس سال کی عمر میں دہلی کی گلیوں سے بے مثال شان و شوکت کے ساتھ بادشاہ کی بہو بننے آئی تھیں، شدید ڈیپریشن کا شکار ہو چکی تھیں اور بینائی جانے لگی تھی۔ 1872 میں مکمل نابینا ہو گئیں۔

مرزا شاہ عباس نے رنگون میں ایک مسلمان تاجر کی بیٹی سے شادی کر لی۔ ان کی نسل اب بھی رنگون میں ہے۔ زینت محل دو خادماؤں کے ساتھ رہنے لگیں۔ انہوں نے واپس ہندوستان جانے کی اجازت طلب کی لیکن وہ مسترد ہو گئی۔ وہ افیم کے نشے کا شکار ہو گئیں۔ ان کی وفات 1882 میں ہوئی۔ اس وقت تک بہادر شاہ ظفر کی قبر کی جگہ بھلائی جا چکی تھی اور انہیں اس کے قریب ہی کسی جگہ دفن کر دیا گیا۔ دو سال بعد سٹروک سے مرزا جوان بخت کی وفات صرف بیالیس سال کی عمر میں ہو گئی۔

آخری عظیم مغل

رنگون کے مسلمانوں نے 1905 میں برٹش سرکار سے درخواست کی کہ بہادر شاہ ظفر کی قبر پر نشانی لگانے کی اجازت دی جائے۔ درخواست میں لکھا گیا کہ ''بطور انسان اور بادشاہ، وہ ہماری تعریف کے مستحق بے شک نہ ہوں، لیکن اس کے مستحق ضرور ہیں کہ انہیں یاد رکھا جائے''۔ اس کی اجازت اگست 1907 میں ملی کہ ان کی قبر پر ایک کتبہ لگا دیا جائے۔ اسی سال زینت محل کی قبر پر کتبہ بھی لگا دیا گیا۔ 1925 تک یہ باقاعدہ عمارت بن گئی جس پر چھت ڈال دی گئی۔

سولہ فروری 1991 کو مزدوروں کو کھدائی کرتے ہوئے اینٹوں سے ڈھکی قبر ملی جو زمین سے تین فٹ نیچے تھی اور جہاں مزار بنایا گیا تھا، وہاں سے پچیس فٹ دور تھا۔ یہاں پر آخری مغل بادشاہ کا ڈھانچہ مل گیا۔

آج بہادر شاہ کی قبر پرانے مزار کے قریب ہے اور یہاں لوگ فاتحہ پڑھنے جاتے ہیں۔ انڈیا، پاکستان اور بنگلہ دیش سے آنے والے پھول چڑھاتے ہیں۔ انڈیا سے بھی راجیو گاندھی نے یہاں قالین چڑھایا تھا۔ من موہن سنگھ خاص طور پر یہاں پہنچے تھے۔ نریندر مودی نے میانمار جا کر قبر پر حاضری دی تھی اور اس کو غسل دیا تھا۔

جیتنے والوں نے جب تاریخ لکھی تو بہادر شاہ ظفر اس میں مذاق بنا دئے گئے۔ تاریخ کی جدید کتابوں میں بہادر شاہ ظفر کے کوئی مداح نہیں۔ ایک طرح سے یہ ٹھیک بھی ہے۔ ان کی زندگی ناکامی کی زندگی تھی۔ انہوں نے ایک سلطنت گرتے دیکھی۔ ان کا طرزِ عمل ہیرو والا نہیں تھا۔ نیشنلسٹ مورخین انہیں لیڈرشپ میں ناکامی کا موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ لیکن بڑا مشکل تھا کہ وہ کچھ بھی اور کر سکتے۔ یا کم از کم بیاسی سالہ شخص کے طور پر کر سکتے۔ جسمانی لحاظ سے کمزور تھے،

بڑھاپے کے باعث ذہنی مضبوطی بھی نہ تھی۔ اپنے فوجیوں کو دینے کو پیسے نہیں تھے۔ اس عمر کے لوگ میدانِ جنگ میں قیادت نہیں کیا کرتے۔ وہ انقلابیوں کی لوٹ مار روکنے میں اور دہلی والوں کو بچانے میں ناکام رہے۔ اگرچہ تاریخی کاغذات دکھاتے ہیں کہ انہوں نے ایسا کرنے کی اپنی پوری کوشش کی تھی۔

وہ نہ ہیرو تھے اور نہ انقلابی لیڈر۔ لیکن وہ ایک شاندار روادار اسلامی تہذیب کی ایک پرکشش علامت تھے۔ اچھے شاعر اور خطاط، جنوبی ایشیا کی تاریخ کے اہم انٹلکچوئل ان کے دربار کا حصہ تھے۔ دہلی کی علمی روایات کے سرپرست، کمیونل ہم آہنگی اور رواداری کی علامت اور ہر ایک میں پسند کئے جانے والے صوفی بادشاہ۔ وہ اپنے کسی بھی حریف کی طرح غیرحساس اور متکبر نہیں تھے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ عیش میں یادِ خدا یا طیش میں خوفِ خدا بھولنے والے شخص تھے۔ اور وہ اپنے ہم آہنگی برقرار رکھنے والے کردار کو بڑی سنجیدگی سے لیتے تھے۔ انقلاب کے دوران بھی وہ ایسا کرتے رہے۔

مغلوں کے چلے جانے کے بعد مسلمانوں کی عزت، اعتماد اور علم ڈوب گئے۔ دولت، تعلیم اور طاقت ہندوؤں کے پاس جانے لگی۔ ہندو اور مسلمانوں میں فاصلہ زیادہ ہونے لگا۔ تلخیاں در آئیں۔ دہلی سے پڑنے والے شگاف وسیع ہوتے گئے۔ وہ وقت آ گیا کہ یہ تصور کرنا محال ہو گیا کہ یہ بھی ممکن ہو سکتا تھا کہ ہندو سپاہی لال قلعے میں ایک مسلمان بادشاہ کے گرد اکٹھا ہوں گے اور مسلمانوں کے ساتھ ملکر مغل سلطنت کے احیاء کی کوشش کریں گے۔

مسلمان خود الگ سمتوں میں بٹ گئے۔ ایک طرف یہ کہ ہمیں اگر واپس آنا ہے تو وہ سیکھنا ہو گا جو ہمارے پاس نہیں۔ ہمیں مغرب سے تعلیم لینا ہو گی۔ جہاں پیچھے رہ گئے تھے، وہ راستہ طے کرنا ہو گا۔ یہ واپسی کا طریقہ ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کو ہندوستان میں آکسفورڈ بنانے کی کوشش اسی فکر کے تحت ہوئی تھی۔ اس فکر سے اٹھنے والی اگلی پود میں انگلستان سے پڑھنے والے محمد علی جناح اور محمد اقبال جیسے لوگ تھے۔

ایک دوسری مخالف ردِ عمل کی سمت مغرب کو مکمل طور پر رد کر دینے اور ماضی کی طرف جانے کی تھی۔ شاہ ولی اللہ کے مایوس ہو جانے والے شاگرد جیسا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے جنہوں نے مختصر مدت کے لئے شملی کے قریب آزاد اسلامی ریاست قائم کی تھی۔ انہوں نے مغل دارالحکومت سے سو میل شمال پر دیوبند کے مقام پر ایک مدرسہ بنایا۔ یہاں پر مغلیہ، ہندو اور یورپی، اس کے نصاب اور فلسفے میں ہر چیز کو مسترد کر دیا گیا۔ یہ طریقہ ہندوستان میں یا انگریز کے خلاف تو کبھی کچھ بھی خاص اثر نہیں کر سکا لیکن اپنے بننے کے 130 سال بعد اسی پس منظر میں تخلیق کئے گئے نصاب کو پڑھ کر نکلنے والوں نے افغانستان میں کچھ عرصے کے لئے حکومت قائم کی۔

آج جب دنیا ایک بار پھر ایک مشکل تقسیم سے دوچار ہے جس کو کئی لوگ مذہبی جنگ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ جہادی اور امپیریل پاورز کی جنگ ایک دوسرے کو مجسم برائی کے طور پر دیکھنے کی جنگ ہے۔

اور اس تاریک دوئی کے وقت میں، بہادر شاہ ظفر کو دیکھا جا سکتا ہے اور ان کی مثال لی جا سکتی ہے۔ زندگی کی طرف پرامن اور برداشت کے رویے کی مثال۔ اور اس پر افسوس کیا جا سکتا ہے کہ برطانیوں نے جب 1857 میں مغل بادشاہت ختم کی تھی تو یہ محض سیاسی خاندان کا خاتمہ نہیں تھا۔ ایک شہر کا خاتمہ نہیں تھا۔ مغلوں کا رواداری کا اور صلحِ کل کا فلسفہ بھی اس کے ساتھ ہی جڑ سے اکھڑ گیا تھا۔ وہ جو صدیوں سے ہندوستان کے انڈواسلامک کلچر کی بنیاد تھا۔ اس کی واپسی پھر کبھی نہیں ہوئی۔